اُڑتے خاکے



سیّد ضمیر جعفری



بُک کارنر
پبلشرز ، بکسیلرز ، جنرل آرڈر سپلائیر
چوک فیصل شہید، مین بازار جہلم ، پاکستان

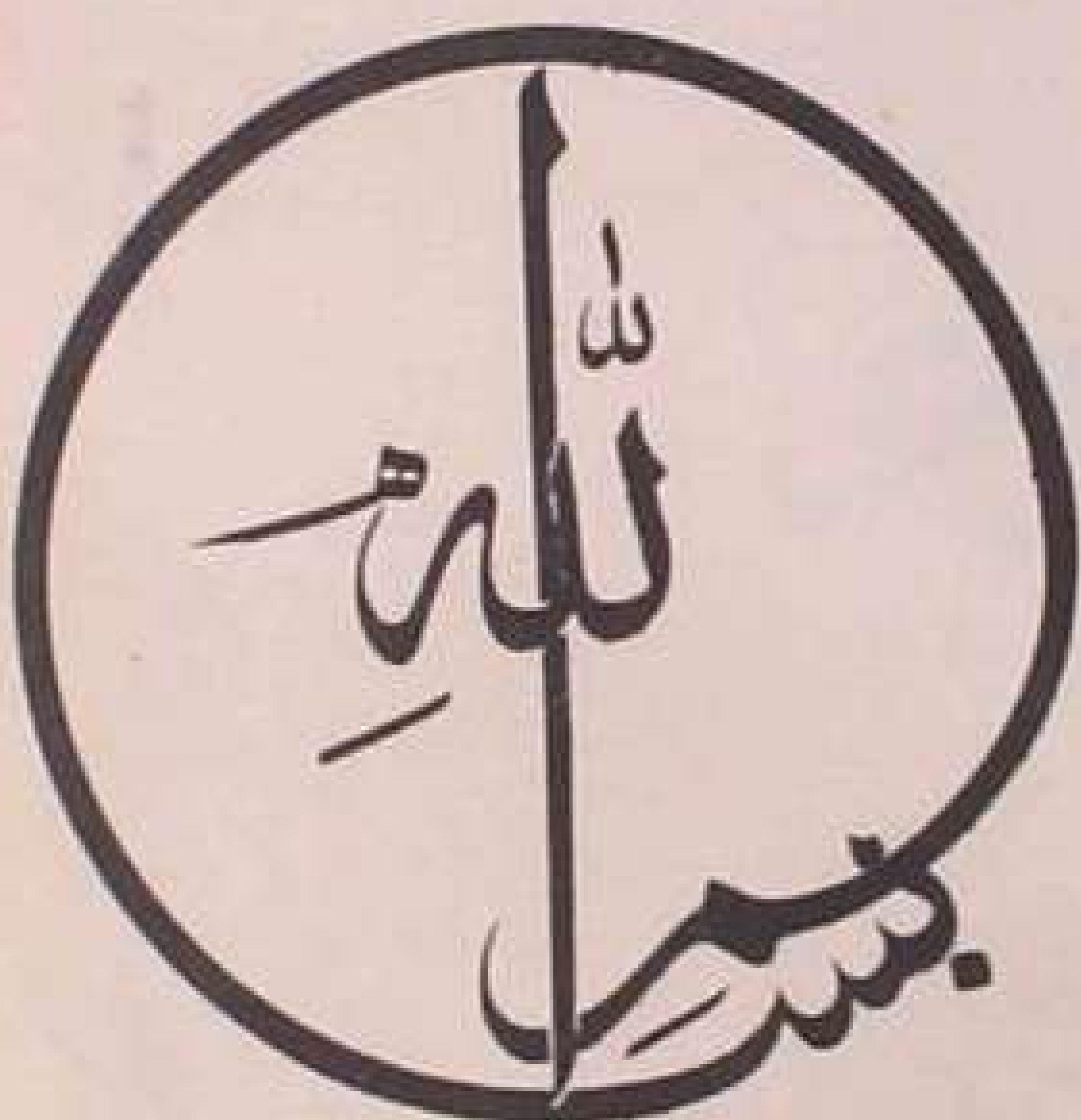
طنزیہ ۔ طربیہ

نظموں غزلوں کا مجموعہ

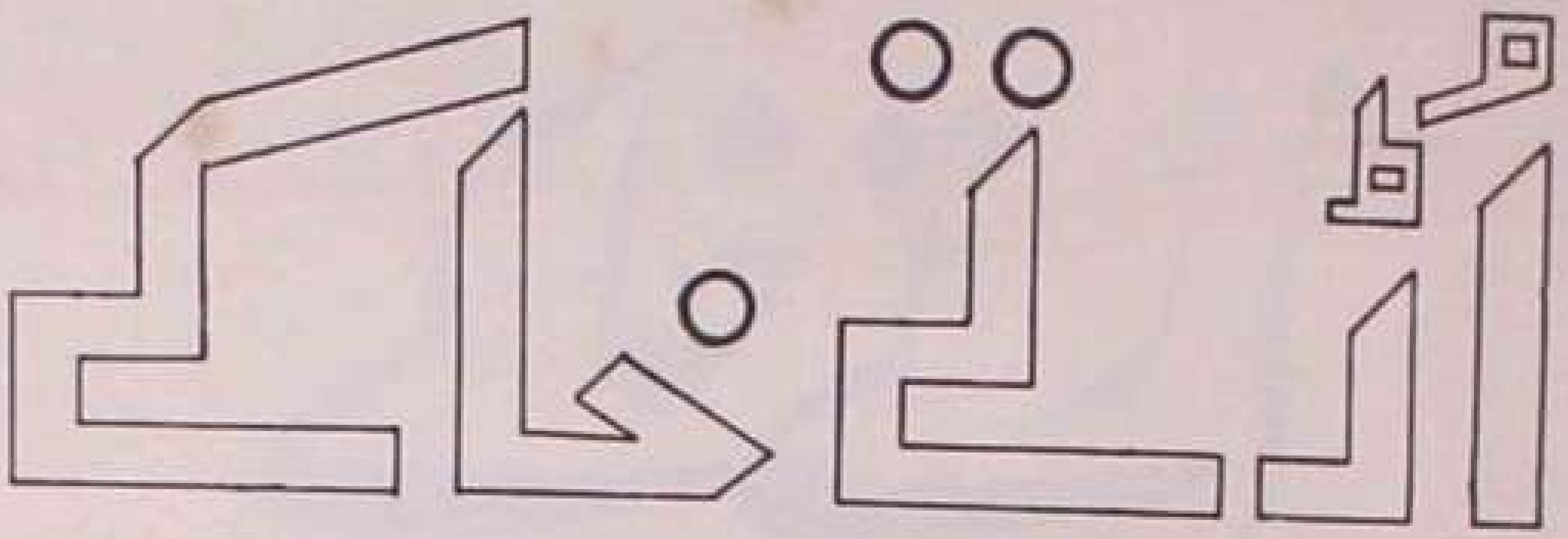
ضمیریات

سید ضمیر جعفری

چھپ کر تیار ہے


بسم الله


الرحمن الرحيم



سیّد ضمیر جعفری

بک کارنر

پبلشرز، بکسیلرز، جنرل آرڈر سپلائیر

چوک فیصل شہید، مین بازار جہلم، پاکستان

فون —— ۲۸۸۵

سیّد ضمیر جعفری اپنی مزاحیہ و طنزیہ شاعری کے حوالے سے اِتنے مشہُور اَور محبُوب ہو چکے ہیں کہ اُن کی شگفتہ نثر اُن کی ظرِیفانہ شاعرِی کے غلغلے میں دب کر رہ گئی ہے۔ حالاں کہ بشاشتُ میں رچی ہُوئی ایسی نثر ہمارے ہاں کم لکھی گئی ہے۔ ضمیر جعفری مٹھاس کا دریا اَور تازگی کا ساون ہیں۔ ان کی تحریریں پڑھتے وقت افسُردگی کی دُھند چھٹ جاتی ہے۔ نثر ہو یا نظم —— سیّد ضمیر جعفری نے "عرُوض" سے زیادہ زندگی کے طُول و عرض کو سیراب کیا ہے۔

شفیق الرحمٰن

اُڑتے خاکے



سیّد ضمیر جعفری



بک کارنر پبلشرز بکسیلرز

فون نمبر ۲۸۸۵ چوک فیصل شہید مین بازار جہلم شہر پاکستان

ضمیریات

سید ضمیر جعفری

انتساب

گورنمنٹ کالج کیمبل پور میں اپنے ادبی گورو دیو

پروفیسر لال ایش کمار

کے چرنوں میں

سید ضمیر جعفری

سعید راشد کی معیاری کتابیں

جرأتوں کے نشاں

اکرم نشانِ حیدر

لیپا ویلی کا ہیرو

لیفٹیننٹ کرنل حق نواز کیانی شہید ستارہ جُرأت دوبار

کردار کی کرنیں

گُفتار کردار قائدِ اعظم

حیات قائداعظم

تذکرۂ شہدا



ضمیر جعفری کا شمار برِصغیر کے معدودے چند مزاح نگار شاعروں اور ادیبوں میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنی تخلیقات میں نئی نئی راہیں اختراع کی ہیں۔ وہ اس لئے بھی دوسروں کے مقابلے میں منفرد و ممتاز ہیں کہ مزاحیہ شاعری اور فکاہیہ نثر کے ساتھ ساتھ سنجیدہ غزل گوئی میں بھی ان کا مقام ہے اور ان کی یہی "دوعملی" ہمیں عزیز ہے۔ زیرِ نظر مجموعہ اُن فکاہیہ تحریروں پر مشتمل ہے جو اُنہوں نے گذشتہ برسوں میں تخلیق کیں اور ان پر قارئین سے بے تحاشا داد بھی وصول کی اور وہ اس قندِ مکرر سے قارئین کو دوبارہ تالیاں بجانے پر مجبور کرنا چاہتے ہیں۔ جمہوریت کے احیاء کے زمانے میں تالیاں بجوانے کا شوق کسے نہ ہوگا۔ پھر پیر و مرشد اس میں کیوں دوسروں سے پیچھے رہ جائیں جب کہ ان کے ووٹروں کی تعداد بہت زیادہ ہے (خصوصاً خواتین کے حلقوں میں)۔

ضمیر جعفری زندگی اور معاشرے سے گہری کومٹمنٹ رکھتے ہیں۔ ان کے مضامین ان کے ضمیر کی آواز ہیں۔ وہ چھوٹے سے چھوٹے موضوع پر بڑی سے بڑی تحریر پیش کرنے پر قادر ہیں۔ ان کی ہنرکاری لفظی بازی گری نہیں بلکہ فکر کی گہرائی اور زندگی کی رنگارنگی سے حرارت حاصل کرتی ہے۔ ان فکاہیہ نثری شہ پاروں میں ان کی ہنرمندی اور جولانیٔ فکر کا حسین امتزاج ان کے طویل سفر کی علامت ہے۔ یہ مجموعہ یقیناً لطیف ادب میں سنگِ میل کی حیثیت ثابت ہوگا۔

وحید قریشی

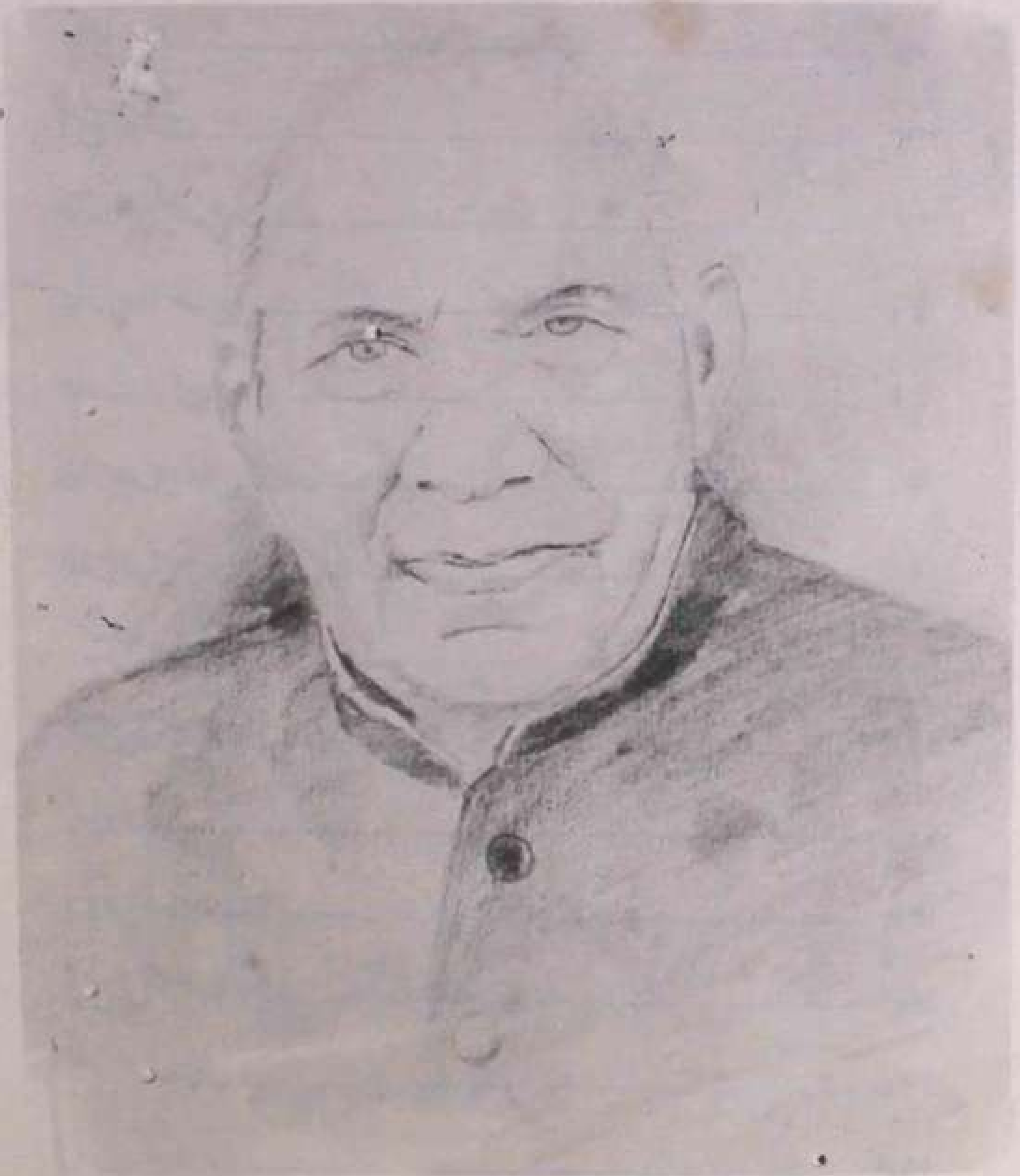
۳- اپریل ۱۹۸۶ء



اشاعت ــــــــــ یکم جنوری ۱۹۸۷ء
اہتمام ــــــــــ شاہد حمید، گلگن شاہد
طابع ــــــــــ آفتاب عالم پریس لاہور
آرٹ ــــــــــ شاہین آرٹ سٹوڈیو
قیمت ــــــــــ پچاس روپے صرف

فہرست

عنوان	صفحہ



سیّد ضمیر جعفری

دیباچہ

مُدّت ہُوئی مَیں نے سیّد ضمیر جعفری پر ایک خاکہ لکھا تھا۔ اُس کا عنوان تھا: "پیرومُرشد"۔ اُس خاکے میں پیرومُرشد کے اَوصاف گنواتے ہُوئے وصف نمبر ۵ میں لکھا تھا:۔

"ضمیر بڑے خالص قسم کے سیّد ہیں۔ بے کسوں کو سہارا دینا آپ کی خاندانی سُنّت ہے۔ اَور یہ سُنّت ضمیر کو بہت مرغوب ہے۔ اَب بے کسوں کی تو وطنِ عزیز میں کمی نہیں۔ چُنانچہ ضمیر اپنے بے کسوں کو صرف مُصنّفین میں تلاش کرتے ہیں اَور بے کسانِ قلم کی کثرت کی وجہ سے ایک سے زیادہ مصنّف زیرِ پرورش رکھتے ہیں۔ رہا اِن کا سہارا دینے کا انداز، تو وُہ دام دِرم سے نہیں، بلکہ دیباچے کی شکل میں دیتے ہیں۔ یقین مانیں کہ دمِ تحریر، پُوری گیارہ کتابیں جو اپنے مُصنّفین کی طرح بے دست و پا ہیں، ضمیر کے دیباچوں کے سہارے کھڑی ہیں۔ بلکہ ان میں سے چند ایک تو قطعی طور پر دم توڑ چکی ہیں۔ فقط ضمیر کے دیباچے انہیں کندھا دیئے پھر رہے ہیں۔ مَیں نے ضمیر کو بارہا مشورہ دِیا کہ اپنے دیباچوں کو اِن آنجہانی کتابوں سے الگ کر کے چھاپ دیں کہ زندوں اَور مُردوں کی ہم نشینی معیوب سی بات ہے لیکن وُہ ٹالتے رہے۔ غالباً انہیں درجن پُورا کرنے کے لِئے ایک دیباچے کی کمی کا اِحساس تھا اَور پھر ایک دن میرے ناشر نے اِطلاع دی کہ ضمیر نے تمہاری کتاب کے لِئے بھی ایک دیباچہ لکھ دیا ہے۔ اَب سوچتا ہُوں کہ اُردُو اَدب کو تو ایک شوخ و رنگین دیباچہ مِل گیا لیکن ہماری کتاب کے لِئے تو وُہ ایک طنّاز مجاور ہی ثابت ہوگا۔"

یہ اَب غالباً پہلی مرتبہ ہے کہ سیّد ضمیر جعفری کی تصنیف کو ایک نیم جان سا دیباچہ ایک طِفلِ شِیرخوار کی طرح اُٹھائے پھرنا ہوگا، سوائے اِس کے کہ جناب ناشر اگلے اڈیشن میں دیباچے کا دُودھ چُھڑا کر کتاب کی ممتا کا بوجھ ہلکا کر دیں۔

دراصل سیّد ضمیر جعفری کی کتاب مُستطاب کا تعارفی دیباچہ لکھنے کے لئے میرا انتخاب بے ہی ناموزوں۔ اِس نظم و نثر کے تاجدار کا تعارف نامہ اگر اکبر الٰہ آبادی (بہشتِ بریں سے آکر) یا مُشتاق احمد یُوسفی (خلدِ فرنگ سے لَوٹ کر) لکھتے تو کوئی بات بھی ہوتی ہَیں کہ اِس پیرِ ظرافت کا ایک ادنیٰ سا مُرید ہُوں۔ میری کیا بساط کہ مُرشد کے سامنے زبان کھولوں؛ مجھ جیسے کم سواد شخص کے لئے تو یہ کام اَیسا ہی ہے جیسے اقوامِ متحدہ کے سٹیج سے پطرس بُخاری کا تعارف کرانے کے لئے سپاہی محمّد خان کو کھڑا کر دیا جائے۔ شاید وُہ جو کچھ کہے گا سچ کہے گا کہ جُھوٹ کی عادت نہیں اُسے۔ مگر اُس کے کہنے کا انداز تو وُہی کاشتکارانہ، دہقانانہ ہوگا۔ بہرحال سپاہی مذکُور کی طرح اَب مجھے بھی قارئین کے سامنے کھڑا تو کر دیا گیا ہے لہٰذا دو ایک باتیں ضرور کہُوں گا۔

پہلی بات تو یہ کہ سیّد ضمیر جعفری کی کتاب کو کسی تعارفی دیباچے کی ضرورت ہی نہیں۔ ان کا نام تو دُنیا کے گوشے گوشے میں پہنچ چکا ہے اَور ان کے متعلق ہر صاحبِ ذوق اُردُو داں نے لَوحِ دل پر ایک پیارا سا دیباچہ لکھ رکھا ہے۔ دمِ تحریر ناروے اَور سویڈن ان کی آواز سے گُونج رہے ہیں۔ اِبتدائے سال میں شرق الاوسط کی فضائیں ان کی صداؤں سے معمُور تھیں اَور گئے سالوں میں وُہ یورپ اَور امریکہ کو اپنے ترنم سے مسحُور کر چکے تھے۔ سو، اِن حالات میں ان کا رسمی تعارف محض تکلف ہے کہ آپ اَپنا تعارف ہوا بہار کی ہے اَور ہوا بھی وُہ جو گذشتہ پچّاس برس سے چمنستانِ اُردُو کے سیلانیوں کے دل و دِماغ کو معطّر کر رہی ہے۔

اکثر قارئین سیّد ضمیر جعفری سے، نثر نگار سے زیادہ بطور مزاح گو شاعر متعارف ہیں کہ مشاعروں کی بدولت شاعری میں وُہ خود بھی شامل ہو جاتے ہیں یعنی اُن کا وُہ بھاری بھرکم وجُود، وُہ ہنستا مُسکراتا چہرہ، وُہ درویشانہ بے پروائی اَور وُہ ملکہ ترنم سے ذرا مُختلف مگر اُتنی ہی مرغوب اَور مخصوص لَے جس سے پانچوں برِّاعظموں کے اُردُو فہم کان آشنا ہیں۔ اَب یہ سمعی اَور بصری سہولتیں ان کو میسّر نہیں ورنہ جس نے ایک دفعہ اُن کی نثر پڑھی، اپنی شعر فہمی سمیت اُن کی نثر پر نثار ہو گیا۔ برِّصغیر میں بے شمار اچھی نثر لکھنے والے ہیں۔ اِس ضمن میں ہر قاری کی اپنی پسند ہے۔ میرے پسندیدہ نثر نگار دو ہیں: مولانا مودُودی مرحُوم اَور سیّد ضمیر جعفری طول عُمرہٗ دونوں کے موضوع مُختلف ہیں: مولانا کا دِین اَور ضمیر کا دُنیا۔ اَور ہر دو نے بالترتیب دِین و دُنیا کو اِس قدر حسین و دِل نشین نثر میں پیش کیا ہے کہ جی جانتا ہے۔ اللہ تعالےٰ دونوں کو اپنے دیگر اعمالِ صالح کے علاوہ

ایسی لازوال اُردُو نثر لکھنے کا اجر دے۔

مولانا تو اللہ کو پیارے ہُوئے مگر ضمیرؔ، اللہ کے کرم سے بدستُور لکھ رہے ہیں۔ اِن کی ہر نئی نثری تحریر یُوں لگتی ہے جیسے کِسی دُور دیس سے کوئی نادر سَوغات آئی ہو۔ مَیں ہر ایسی تحریر کو ہزار شوق سے پہلے دیکھتا ہُوں۔ پھر آنکھوں سے لگاتا ہُوں اَور پھر لفظاً لفظاً پڑھتے ہُوئے یُوں محسُوس کرتا ہُوں جیسے دُنیا جہان کی رعنایاں اَور دِلرُبایاں سمیٹ رہا ہُوں ——— عزیز قاری! ذرا ورق اُلٹیں۔ اگلے صفحہ پر یہی رعنایاں اَور دِلرُبایاں آپ کا اِنتظار کر رہی ہیں۔

مُحمّد خاں
راولپنڈی کلب
۱۴۔ نومبر ۱۹۸۵ء

ضمیریات

سیّد ضمیر جعفری

کا مجموعۂ کلام

چاچا دینا

"چاچا دین محمد" ہمارے کالج کے ان نامی گرامی طلباء میں سے تھے جو مسلسل فیل ہو کر طالب علم سے زیادہ "پروفیسر" معلوم ہونے لگتے ہیں اور بپایان کار "خلیفہ" کے خطاب سے سرفراز ہوتے ہیں۔ دین محمد البتہ "خلیفہ" کے بجائے "چاچا" کے ہر دلعزیز نام سے یاد کئے جاتے تھے۔ وہ "خلیفہ" کیوں نہیں تھے، یا "چاچا" کیوں تھے۔ یہ دراصل آثار قدیمہ کی ایک ایسی بحث تھی جس میں پڑنے کی ہمیں نہ فرصت تھی نہ ہمت۔ وہ ہم سے بہت پہلے چاچا کی حیثیت میں "کنفرم" ہو چکے تھے۔ بلکہ "دین محمد" تو مدت سے غائب ہو چکا تھا۔ ہمارے زمانے میں محض "چاچا" رہ گیا تھا۔ پرنسپل سے لے کر گھنٹی بجانے والے بوڑھے لٹیین چپڑاسی تک سب انہیں "چاچا" ہی کہتے تھے۔ اب اتنے پرانے راسخ اور جمے ہوئے چاچا کو اکھاڑ کر پاتال سے "دین محمد" کو ڈھونڈھنا اور نئے سرے سے اس پر "قبائے خلافت" موزوں کرنا آسان کام نہ تھا۔

یوں بھی وہ اپنے نوعمر اور نسبتاً کم سن ہم سبقوں کے چچا ہی معلوم ہوتے تھے

خود ہوسٹل کے سپرنٹنڈنٹ شیخ صاحب عمر میں ان سے چھوٹے تھے۔ اپنے پروفیسروں میں سے بعض جو اسی کالج کے پرانے طالب علم تھے۔ چاچا سے بہت پیچھے ہونے تھے۔ پھر وہ ان کے ہم سبق ہوئے۔ پھر آگے نکل گئے۔ پھر یہیں پروفیسر مقرر ہو گئے مگر چاچا وہی طالب علم کے طالب علم۔

ہمارے وقت میں چاچا رفتہ رفتہ بی۔ اے کے آخری سال میں پہنچ چکے تھے۔ مگر فائینل میں ڈیرے ڈالے ابھی صرف چار یا پانچ سال ہوئے تھے ان کی عمر تیس سے خاصی اوپر نکل چکی تھی مگر ان کے عزم و استقلال سے نظر آتا تھا کہ بقیہ زندگی مادرِ علمی ہی کے آغوش میں گزارنے کا ارادہ رکھتے تھے یار لوگوں کا خیال تھا کہ اگر چاچا کی رفتار یہی رہی ——— اور رفتار کے معاملے میں صاف ظاہر تھا کہ جب تک یونیورسٹی اپنی خو نہ بدلے گی، وہ اپنی وضع ہرگز نہ بدلیں گے ——— تو چاچا کا بڑا لڑکا جو اس وقت آٹھویں جماعت میں تھا، والد نامدار کو یہیں آپکڑے گا بلکہ عجیب نہیں کہ وہ باپ سے آگے نکل کر اس کا "استاد" تک بن جائے بعض زندہ دلوں کی رائے تھی کہ چاچا کالج میں دراصل اپنے ارجمند ہی کے انتظار میں پڑے ہوئے تھے۔

چاچا دین محمد بلا کی بھرپور دلچسپ اور گوناگوں شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ایک خاصے کھاتے پیتے زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ فکر نہ فاقہ۔ کالج سے نکل کر سیاسیات میں حصہ لینے کا پروگرام تھا مگر یہ کالج کا مرحلہ ہی کسی صورت میں طے ہونے میں نہ آتا تھا۔ ادھر پالٹیکس بھی آخر کالج سے باہر کھڑے کھڑے کب تک ان کا انتظار کرتی چنانچہ چاچا کے کالج سے نکلنے کی جب کوئی امید نظر نہ آئی تو پالٹیکس نے انہیں خود کالج کے اندر آلیا۔ چاچا گو اب تک اسمبلی میں نہ پہنچ سکے تھے (اگرچہ پروگرام

کے مطابق وہ صوبے کا سب سے کم عمر وزیر ہونے کا امتیاز حاصل کرنے کی تمنا رکھتے تھے۔ تاہم کالج کو انہوں نے اپنے لئے "اسمبلی" بنالیا تھا۔ مدت تک وہ طلبا کی لیڈری کرتے رہے۔ ہڑتالیں کرواتے اور جلوس نکلواتے لیکن اب کچھ مدت سے انہوں نے گویا "سپیکر" کی سی حیثیت حاصل کرلی تھی۔ اب وہ نوجوان لیڈروں کی پیٹھ تھپکا کرتے، مشورے اور رولنگ دیتے۔ مقامی سیاست کا ہر جوڑ توڑ انہیں کے کمرے میں صورت پذیر ہوتا۔

باتیں کرنے کا انہیں خالص چسکا تھا اور بات کرنے کا خاصا ڈھب بھی آگیا تھا کالج میں اپنی گذشتہ پندرہ سالہ زندگی میں لے دے کر انہوں نے یہی ایک فن سیکھا تھا۔

اپنی مستقل سینیارٹی کے زور پر چاچا ہوسٹل کے شاندار سے شاندار کیوبیکل کے حق دار تھے۔ وہ اچھے سے اچھے کیوبیکل میں برسوں بودوباش رکھ بھی چکے تھے۔ مگر پچھلے دو ایک سالوں سے تبدیلی آب وہوا کی غرض سے کونے کی ایک لمبی ڈارمیٹری میں پڑے تھے جس کے ساتھ ملی ہوئی ٹک شاپ تھی پھر غسل خانے تھے جن کے سب سے بڑے سرپرست آپ ہی تھے۔ دراصل اب چاچا کی سوشل حیثیت اتنی پھیل پھول چکی تھی کہ کیوبیکل کی تنگنائے غزل اس پھیلاؤ کے لئے قطعاً ناکافی تھی۔

یوں تو چاچا دن میں بھی کالج کچھ واجبی ہی جایا کرتے تھے۔ دن بھر ان کی ڈارمیٹری میں ناغہ کرنے والوں کا جمگھٹ لگا رہتا۔ خیر دین کی ٹک شاپ سے لسی شربت، فالودے اور چائے کے ٹرے دن بھر دوڑتے رہتے اور ـــــ دن بھر ـــــ چاچا اپنا خطبۂ صدارت ارشاد فرماتے رہتے مگر رات کو کھانے کے بعد تو ان کے ہاں باقاعدہ دربار جمتا تھا۔ کامن روم کی سب کرسیاں سمٹ کر وہیں آجاتیں اور رات کو دو دو بجے تک غپ شپ کا

سلسلہ جاری رہتا۔ سپرنٹنڈنٹ اس "مجمع خلاف قانون" کا سخت مخالف تھا۔ تازہ وار دان بساط ہوائے دل کو فرداً فرداً وہ اس خطرے سے متنبہ بھی کر دیتا تھا۔ مگر چاچا کو اس محفل آرائی سے روکنے کی ہمت اس میں نہ تھی۔ چاچا کو ہوسٹل اور کالج دونوں جگہ ایک قسم کی "صوبائی خود مختاری" حاصل تھی اور واقعی جب وہ اس دربار عام میں صرف بنیان اور دھوتی پہنے آلتی پالتی مار کے بیٹھتے تو اپنے گھٹے ہوئے سر، کمر سے دس بارہ انچ آگے بڑھی ہوئی توند اور تیل پلائی ہوئی رانوں کے ساتھ یوں معلوم ہوتے جیسے کارپوریشن کا کوئی دیہاتی ممبر بیٹھا ہو۔

چاچا ہاسٹل کے بے تاج بادشاہ تھے!

چاچا کی باتوں کا کوئی خاص موضوع نہ ہوتا تھا۔ وہ ہر موضوع پر گفتگو کرتے تھے۔ گفتگو برائے گفتگو میں کسی خاص موضوع کی ضرورت بھی نہیں ہوتی اور چاچا تو خیر گھنٹوں بیٹھے پرنسپل ہی میں سے کیڑے نکال سکتے تھے۔ تاہم دو تین موضوعات انہیں بطور خاص مرغوب تھے ایک تو انہیں سینما سے سخت نفرت تھی لہٰذا اس کے خلاف مسلسل بولتے تھے۔ ایکٹروں، ایکٹرسوں، ڈائریکٹروں، پروڈیوسروں، تماشائیوں سب کو بے نقط سناتے۔ سینما سے ان کی نفرت کا یہ عالم تھا کہ کسی ایکٹر کے نام یا اس کی صورت تک سے واقف نہ تھے۔ دیواروں پر سینما کے اشتہارات دیکھتے تو آنکھیں بند کر لیتے۔ منہ پھیر لیتے۔ گمان ہوتا تھا جیسے سہراب مودی، شانتارام وغیرہ سے انہیں کوئی ذاتی دشمنی تھی۔

چاچا کو اپنے خاندانی شرف و امتیاز پر فخر تھا۔ ایک نامور قدیم خاندان میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے اجداد میں اکثر بزرگ جلیل القدر شہنشاہوں کے وزیر اور منصب دار تھے۔ موجودہ اور گذشتہ دونوں نسل کے رشتہ داروں میں تحصیلدار، نامزد ڈپٹی کلکٹر،

ڈپٹی کمشنر، کمشنر، کمیٹی اور ڈسٹرکٹ بورڈ کے صدر اور صوبائی اور مرکزی وزرا بھرے پڑے تھے۔ ہوسٹل میں انہیں جو رشتہ دار ملنے آتا۔ اس کا کوئی نہ کوئی بڑا عہدہ ضرور ہوتا جس سے ہمیں بعد میں مطلع کیا جاتا۔ حتیٰ کہ اپنی ذاتی معلومات کی بنا پر میں کہہ سکتا ہوں کہ پچھلے چار سالوں میں صوبے کا جو بڑا آدمی بھی مرا تھا، چاچا کا رشتہ دار تھا۔ چاچا نے ایک ایک کا تعلق خاطر کے ساتھ سوگ منایا—— آخر آخر میں تو نوبت یہ ہو گئی تھی کہ کسی بڑے افسر یا نامور لیڈر کے مرنے کی خبر اخبار میں نظر آئی نہیں کہ لوگ خود بخود اظہار تعزیت کے لئے چاچا کی ڈارمیٹری میں پہنچ گئے۔ اس طرح ترقیوں اور تقرریوں، صدارتوں اور وزارتوں وغیرہ پر مبارک باد کی تقریبات رہتیں۔

—— بدخبری ہو یا خوش خبری۔ وہ احباب کی خاطر تواضع میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتے تھے خاطر و مدارات کے خلوص، گرم جوشی اور انداز مدارات سے آپ یہ سمجھ ہی نہ سکتے تھے۔ کہ یہ کوئی مجلس غم تھی یا محفل نشاط۔

منظور اور میں ہم دونوں چاچا کے پاس مستقل بیٹھنے والوں میں سے تھے۔ چاچا کا دستور تھا کہ کھانے کے بعد شام کو جو بیٹھک ہوتی تھی، اس میں زیادہ تر اپنے عزیزوں رشتہ داروں ہی کے "فضائل" بیان کیا کرتے تھے ایک مرتبہ شجرہ نسب کے "درخت" پر بر چڑھ جاتے تو اترنے کا نام نہ لیتے پہلی سانس میں خان خاناں بیرم خاں پر جا کر رکتے۔ دوسرا پڑاؤ تیمور کے ایک وزیر پر ہوتا۔ تیسری منزل سکندر اعظم کے جرنیل سیلوکس پر شجرہ نسب کا یہ درخت بہت ہی لمبا چوڑا تھا اور چاچا باقاعدگی سے اس کی شاخوں ٹہنیوں وغیرہ کا جائزہ لیتے تھے ہم روزانہ یہ قصے سن سن کر عاجز آچکے تھے مگر ہوسٹل میں رہ کر چاچا کے ہاں گئے بغیر بات بنتی نہ تھی۔

سالانہ امتحان ختم ہو چکا تھا ہوسٹل کا شیرازہ بکھرنے والا تھا۔ فائنل کے طلباء، جن میں بادلِ ناخواستہ چاچا بھی شامل تھے۔ جونیئر طلباء سے ایک الوداعی دعوت کھا کر گھروں کی راہ لینے والے تھے، فرصت، بے فکری بے تکلفی اور چل چلاؤ کے دن تھے۔ چاچا کی ڈامیٹری معمول سے زیادہ آباد تھی۔

میں اور منظور ایک شام چاچا کی طرف جا رہے تھے کہ منظور بولا یار یہ چاچا کے رشتہ داروں نے دم ناک میں کر دیا ہے۔

"بات تو یہی ہے۔ مگر بھائی ــــ تھوڑی سی رہ گئی ہے اسے بھی گزار دے۔" میں نے جواب دیا۔

"نہیں جی،" منظور نے جو خود بھی ایک ہنگامہ پسند لیڈر طبع" نوجوان تھا سر کے گنجان بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا "خدا کی قسم! میں اس چاچا کو سبق سکھا کر چھوڑوں گا کم از کم اسے معلوم تو ہو جائے کہ ہم لوگ، جو اتنی مدت بنتے رہے ہیں تو نرے چغد نہ تھے۔"

"مگر کیسے؟" میں نے اسکیم پوچھی۔

"اسکیم یہ ہے،" منظور کچھ سوچتے ہوئے بولا "اسکیم یہ ہے کہ آج میں بھی اپنے رشتہ داروں کی ڈینگیں لڑاؤں گا۔ رشتہ دار پر رشتہ دار چھوڑوں گا۔ نہلے پر دہلے مارونگا۔"

مگر اتنے ڈھیر سارے اونچے اونچے رشتہ دار کہاں سے لاؤ گے پیارے؟" میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا ــــ "لے دے کے تمہارا ایک چچا دفعہ ۳۰ کا مجسٹریٹ تھا سو پچھلے سال سے موقوف ہو کر وہ بھی گھر آ بیٹھا ہے ــــ گنجی نہائے کیا ــــ نچوڑے کیا؟"

منظور نے زور کا ایک قہقہہ لگایا اور کہا "جیسے وہ ساری دنیا سچ مچ چاچا کی رشتہ دار

ہوتی ہے۔ تمہارے نزدیک ایشیا کی پوری تاریخ غالباً چاچا کے خاندان پر اتری ہے؟ —— میرے بھائی! جب رشتہ دار پکڑنے ہی ٹھہرے تو —— ملک خدا تنگ نیست"

ہم پہنچے تو ڈرامیٹری کی محفل رنگ پر جا رہی تھی۔ سامعین برف میں لگے ہوئے دہی کی ترش لسی پی رہے تھے اور چاچا اپنے شجرۂ نسب کے درخت پر بہت اونچے جا چکے تھے۔ غالباً سلیوکس کے آس پاس کہیں پھر رہے تھے چاچا ذرا اونچا جانے لگا تو منظور نے ٹوکنا شروع کیا۔ درمیان میں موقع بے موقع اپنے بزرگ چھوڑنے شروع کئے۔ ظاہر ہے کہ چاچا کے لئے یہ بات سخت ناگوار تھی۔ انہوں نے پہلے تو نرمی اور شفقت سے سمجھانے کی کوشش کی کہ عزیزمن دیکھو۔ دوسرے کی بات کاٹنا سخت بدتمیزی کی بات ہے لیکن جب منظور باز نہ آیا تو چاچا قدرے برہم ہو کر بولے:

—— افسوس کہ بی۔اے کا امتحان تک دے بیٹھے ہو اور جن ذلیل ٹٹ پونجیوں میں سے تم ہو۔ اندیشہ ہے کہ پاس ہو کر رہو گے لیکن برخوردار! تم یہاں سے کچھ سیکھ کر نہیں جا رہے۔ اس کلرکی والی ڈگری کو شہد لگا کر چاٹتے رہنا۔

—— لیکن منظور پر کسی تادیب یا سرزنش کا کوئی اثر نہ تھا۔ وہ چاچا کے روبرو اپنے رشتہ داروں اور بزرگوں کے ڈھیر کے ڈھیر لگائے جا رہا تھا —— چاچا کی پیش قدمی کا راستہ روکے کھڑا تھا۔ لوگ حیران تھے۔

بات جب بڑھ گئی تو بیچوں کے بیچ بچاؤ کرنے پر طے یہ ہوا کہ اگلے ہفتے کی رات کو چاچا اور منظور دونوں اپنے اپنے قدیم وجدید قابل فخر بزرگوں اور رشتہ داروں کی تصویریں لائیں گے اور تاش کے پتوں کی طرح ان تصویروں سے کھیلا جائے گا۔ کرکٹ ٹیم کے

ہر دلعزیز کپتان آفتاب احمد خان کو ثالث بالخیر مقرر کیا گیا۔ اور فتح و شکست کا اصول یہ وضع ہوا کہ عہدہ و منصب کے بھی خیر کچھ نمبر ہوں گے۔ لیکن ہار جیت کا اصل دار و مدار رشتہ دار کی شکل و صورت پر ہو گا۔ دونوں طرف سے پانچ قدیم بزرگ اور دس جدید رشتہ دار کھیلنے کی اجازت ہو گی ــــــ اتنے بڑے دو خاندانوں میں سے دس بیس آدمی تو نکل ہی آنے چاہیئیں اور وہ بڑا خاندان ہی کیا جس کے پاس بزرگوں کی تصاویر تک نہ ہوں۔"

ہفتے کی رات کو چاچا کی ڈارمیٹری میں رش کا یہ حال تھا کہ اکھاڑہ ڈارمیٹری میں سے اٹھا کر ہوسٹل کے چمن زار میں قائم کرنا پڑا۔ کچھ ایسا منظر تھا جو الیکشن کے دنوں میں پولنگ اسٹیشن پر نظر آتا ہے۔ چاچا اور منظور کے حامیوں کے الگ الگ کیمپ تھے چاچا کے کیمپ میں رونق اور گہما گہمی تھی، لسی اور فالودہ تقسیم ہو رہا تھا منظور کے کیمپ میں تعلقات کے مارے ہوئے ہم آٹھ دس آدمی بیٹھے مکھیاں مار رہے تھے بلکہ ہمارا "پہلوان"، جو پچھلے تین چار روز سے خدا معلوم کہاں غائب تھا ابھی تک پہنچا بھی نہ تھا۔

بارے کہ کوئی نو بجے کے قریب ہمارا پہلوان بھی آ پہنچا اس کے ہاتھ میں ایک بڑا سا لفافہ تھا جس میں اس کے بزرگ بند تھے، دوسری طرف چاچا نے ایک بڑے تھیلے میں "بزرگوں" کا انبار لگا رکھا تھا لیکن ہمیں منظور کے ہاتھ میں ایک لفافہ دیکھ کر بھی ایک گونہ اطمینان ہو گیا ورنہ یہاں تو اندیشہ یہ تھا کہ اسے کہیں خالی ہاتھ ہی نہ لڑنا پڑے۔

ٹھیک نو بجے درمیان میں ایک میز بچھا دی گئی اور ثالث آفتاب احمد خان نے

مقابلے کا اعلان کر دیا۔ چاچا دینا اور منظور آمنے سامنے بیٹھ گئے اور دونوں کے دو دو حمایتی تصویروں کے بنڈلوں سمیت میز کے قریب آ گئے۔ ہجوم پر ایک سناٹا چھا گیا جیسے واقعی کوئی تاریخی معرکہ ان کے سامنے تھا۔

چاچا نے سب سے پہلے وہی خان خاناں بیرم خان کھیلا۔ ثالث نے بیرم خان کی تصویر اٹھا کر چاروں طرف گھما کر تماشائیوں کو دکھائی اور پھر چاچا کے سرگرم حمایتی لالہ یعقوب نے تاریخ ہند میں سے بیرم خان کے حالات پڑھ کر سنائے حاضرین نے پرشور تالیوں سے بیرم خان کا استقبال کیا —— "بیرم خان ہندوستان میں چاچا کے مورث اعلیٰ تھے۔

"بیرم خان" کو دیکھ کر ہمارے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگیں ہمیں یقین تھا کہ منظور کے لفافے میں پٹواریوں، گرداوروں اور نہر کے پنسال نویسوں وغیرہ کے سوا اور کیا ہو گا؟ اور یہ سب کے سب مل کر بھی "بیرم خان" کو چت نہیں کر سکتے مگر منظور بڑے اطمینان سے اٹھا اور لفافے میں سے ایک تصویر کھینچ کر میز پر ڈال دی ثالث نے تصویر ہاتھوں میں بلند کی تو لوگ بھونچکارہ گئے —— یہ جلال الدین اکبر شاہنشاہ ہندوستان کی تصویر تھی۔

تصویر اگرچہ خاندانی البم کے بجائے کسی کتاب میں سے پھاڑی گئی تھی مگر اکبر بہرحال اکبر تھا۔ لالہ یعقوب نے ایک آئینی اعتراض کرتے ہوئے پوچھا تو کیا آپ مغل بادشاہوں کی اولاد میں سے ہیں؟"

"جی ہاں! میں دارا شکوہ کی نسل میں سے ہوں۔ ذرا صبر کیجئے ابھی اورنگزیب بھی میدان میں آ رہا ہے۔"

اس پر دونوں طرف بڑا ہنگامہ ہوا۔ ایک دوسرے سے ثبوت طلب کئے گئے لیکن معلوم ہوا کہ ثبوت دونوں کے پاس کوئی نہ تھا ـــــ چاچا کے پاس بیرم خان کی پرانی روغنی تصویر ضرور تھی لیکن ہمارا جواب تھا کہ ایسی تصویریں تو کباڑیوں کے ہاں سے عام مل جاتی ہیں۔ بہرحال ثالث نے اکبر کے حق میں فیصلہ دے دیا اور اس پہلی شاندار فتح کے ساتھ ہی رائے عامہ کی ہمدردیاں بھی ہمارے ساتھ ہو گئیں ثالث کو منظور نے پہلے گانٹھ رکھا تھا۔

یہاں چاچا کے طرفداروں نے ایک اور چال چلی۔ انہیں معلوم تھا کہ چاچا کے پاس قدیم بزرگوں میں وزراء، امراء اور جاگیردار وغیرہ ہی تھے یا زیادہ سے زیادہ سلیوکس اور امیر تیمور کا ایک سپہ سالار تھا مگر وہ اب جان گئے تھے کہ منظور کے لفافے میں بابر سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک پورا خاندان مغلیہ بند تھا۔ بادشاہ لاکھ لٹ پٹ جائے آخر بادشاہ ہے۔ پھر بابر، ہمایوں اکبر اور جہانگیر وغیرہ کو کون شکست دے سکتا ہے ان کے مقابلہ کے لئے سلیوکس کے آقائے ولی نعمت خود سکندر اعظم کی ضرورت تھی مگر سکندر اعظم بدقسمتی سے چاچا کی پٹاری میں موجود نہ تھا اور یہ بیرم خان خانی خاں آصف الدولہ اور شائستہ خاں، جنہیں چاچا اٹھائے پھر رہے تھے اگرچہ بڑے نام آور بزرگ تھے۔ لیکن اگر سچ مچ یہ تصویریں زندہ ہو جائیں اور منظور کے لفافہ میں سے نکل کر شہنشاہ ہند جلال الدین اکبر ان کے سامنے آ جائیں تو یہ سب ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو جائیں گے۔ یہ سوچ کر چاچا کے حامیوں نے پینترا بدلا۔ انہوں نے کہا چونکہ مغل بادشاہوں کا معاملہ درمیان میں آگیا ہے اور بادشاہوں کے معاملے میں مسلمان بے حد جذباتی ہیں لہٰذا ہمیں انصاف کی توقع نہیں۔

اب جدید زمانہ کے رشتہ داروں میں مقابلہ شروع ہوا۔

چاچا کی طرف سے ایک بزرگ کھیلے گئے۔

خشخشی ڈاڑھی اور لبوں پر سے کتری ہوئی مونچھیں، سنہری فریم کی عینک لارڈ لنلتھگو کے زمانہ میں پبلک سروس کمیشن کے ممبر رہ چکے تھے یہ ان کے پھوپھا تھے۔

الہٰی خیر! پرانے زمانے کے قصے میں تو منظور بادشاہوں کو اپنی کمک پر سے آیا تھا لیکن ان وزیر مناصب کا توڑ کہاں سے لائے گا ــــــ؟ ہمیں اپنی شکست یقینی نظر آنے لگی۔

"یہ ہیں میرے ماموں" منظور نے ایک خوبصورت نوجوان کی تصویر میز پر رکھتے ہوئے کہا، "ایم۔ اے میں پڑھ رہے تھے کہ ان کا انتقال ہو گیا۔ بی اے میں یونیورسٹی بھر میں اوّل آئے تھے۔ زندہ رہتے تو بڑے مرتبے کو پہنچتے۔"

تصویر گھمائی گئی تو وہ الناصر یا دلیپ کمار میں سے کسی فلم ایکٹر کی تصویر تھی۔ چاچا کو تو خیر کیا پتہ چلتا، مگر لالہ یعقوب نے فوراً اعتراض کیا۔

"یہ تو فلم ایکٹر الناصر کا فوٹو ہے۔"

"ممکن ہے دونوں ہم صورت ہوں۔ ویسے یہ میرے ماموں، خداداد حسین خان ہیں۔" منظور نے انتہائی بے پرواہی اور پر اعتمادی سے جواب دیا اور ثالث نے اعتراض رد کر دیا۔

اب چاچا کے حامیوں نے پبلک سروس کمیشن کی ممبری کو اچھالنا شروع کیا لیکن ادھر خداداد حسین خان بھی۔ بڑی صلاحیتوں کا نوجوان تھا۔ بی۔ اے میں بی اے کا ریکارڈ توڑ چکا تھا۔ موت مہلت دیتی تو کیا عجب تھا کہ ایم اے میں سرے سے یونیورسٹی ہی

کو نوٹر کے رکھ دیتا اور پھر سول سروس کے مقابلے میں کم از کم پہلے نمبر پر آتا اور کسی "برخوردار صوبے کی چیف کمشنری پر ہاتھ صاف کر جاتا۔"

یہاں چاچا کے وکیل یعقوب لالہ نے ایک دلچسپ آئینی نکتہ اٹھا کر چاچا کے پھوپھا کی فضیلت ثابت کرنے کی ایک آخری کوشش کی دلیل یہ تھی کہ پھوپھا وزیر رہ چکے تھے۔ لہٰذا خداداد حسین خان کی کامیابی کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ یوں بھی چننے والے اور چنے جانے والے میں جو فرق ہے وہ ظاہر ہے۔

منظور نے جواب دیا۔

"اگر آپ کے پھوپھا میاں خداداد جیسے جینئس نوجوان کے چناؤ کی مخالفت کرتے تو اس کے معنی صاف یہ تھے کہ وہ خود اپنے منصب کے نا اہل تھے . . . ." اور اس پر رائے عامہ نے جواب جاو بیجا امیر کے مقابلے میں غریب کا ساتھ دے رہی تھی، داد کا ڈونگرا برسا دیا اور جوانا مرگ خداداد حسین، پبلک سروس کمیشن کے ممبر پر بازی لے گیا۔

چاچا نے اس پر تاؤ کھا کر بڑے زور سے ایک تصویر میز پہ ٹپخ دی۔ شیروانی کے ساتھ شلوار پہنے ہوئے بڑی بڑی مونچھوں والے ایک صاحب تھے۔ جنہوں نے سکندر حیاتی طرے والی پگڑی باندھ رکھی تھی، مڈل تک پڑھے ہوئے تھے مگر ایک صوبے کے وزیر رہ چکے تھے اب اگرچہ کچھ مدت سے بے مصرف سے ہو چکے تھے تاہم صوبے کے اونچے لیڈروں میں ان کا شمار ہوتا تھا اور ہر وزارتی ردو بدل کے موقع پر زیر غور امیدواروں کی فہرست میں ان کا نام ضرور لے لیا جاتا تھا۔ ہاں ایک ٹانگ دوسری سے قدرے چھوٹی تھی۔ چاچا نے ان کی تصویر کے ساتھ اخبارات کے تراشوں کا ایک ڈھیر بھی میز پر ڈال دیا۔ یہ وہ بیانات تھے جو چاچا کے اس خالو نے وقتاً فوقتاً شائع کرائے تھے مگر چاچا کے یہ سابق وزیر اور

حال لیڈر خالو، شکل و صورت کے نمبروں پر منظور کے چچا "سہراب مودی"
کے ہاتھوں پٹ گیا۔

خالو کے بعد چاچا کے سات آٹھ بچے اور تاؤ، بچوں کے چچے اور تاؤ، جن میں
دیہات سدھار کا ایک کمشنر، تعلقات عامہ کا ایک ڈائریکٹر اور فوج کا ایک بوڑھا
آنریری کپتان زیادہ نمایاں تھے۔ یکے بعد دیگرے یہ سب منظور کے ایکٹروں کے
ہاتھوں مارے گئے۔ چاچا کے رشتہ داروں کو اصل میں بھوگ یہ آپڑا تھا کہ دفتر کی
کرسیوں نے ان کے چہرے بری طرح مسخ کر ڈالے تھے۔ فائلوں نے آنکھوں سے
چمک اور رخساروں سے زندگی نچوڑ رکھی تھی۔ کہیں کہیں اگر چہرے پر تھوڑی بہت
رونق بحال تھی تو چاچا کے خاندان کے خوف ناک طور پر اونچی، نکیلی اور مڑی ہوئی
خاندانی ناکوں نے حالات کو سخت ابتر کر رکھا تھا۔ دوسری طرف منظور کے معمولی
معمولی عہدہ دار، سیاح، تاجر اور پروفیسر تھے مگر دراصل چونکہ سب ایکٹر تھے۔ لہٰذا
دیدہ زیبی کے پورے نمبر لئے جا رہے تھے، جو ہار جیت کا اصل معیار طے پا چکا تھا۔
ہوسٹل کی رائے عامہ جیسے کالج کے بعد اپنے سامنے بھی معمولی کلرکی کا میدان سامنے
نظر آرہا تھا اونچے منصب داروں کے خلاف تھی۔ کچھ چاچا کی "خاندانی ناک" نے
اسے مشتعل کر رکھا تھا۔ چنانچہ جب تعلقات عامہ کے ڈائریکٹر پر بحث ہو رہی تھی تو
تماشائیوں میں سے کسی نے باآواز بلند کہا۔

"اسے اٹھا کر کسی عجائب خانہ میں رکھ دیجئے جناب!

بہر حال جب رشتہ داروں کا یہ "جلوس" بہت لمبا ہو گیا تو تماشائیوں میں
سے کالج ڈرامیٹک یونین کے شریر و بذلہ سنج سیکرٹری سعد اللہ بٹ نے چلا

کر مطالبہ کیا:

اپنے اپنے والد ماجد میدان میں اتاریئے۔" یہ مطالبہ کچھ ایسا مقبول ہوا کہ تمام ہجوم یکبارگی چلا اٹھا:

"باپ چاہیئے۔ باپ لایئے.... باپ۔ باپ۔ باپ۔" مگر باپ نہ چاچا کے بنڈل میں تھا نہ منظور کے لفافے میں۔

ابن الوقت

"ابن الوقت" کی کوئی فیصلہ کن تعریف کرنا مشکل ہے۔ آرٹ کے بارے میں کوئی دوٹوک بات نہیں کہی جاسکتی اور "ابن الوقتی" ایک آرٹ ہے۔

نہ حد جس کے پیچھے، نہ حد سامنے

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ "ابن الوقت" زندگی کے عزیز ترین اصولوں اور مقدس سے مقدس قدروں کو فروخت کر دیتا ہے ..... وہ ایک بہت صیقل شدہ خوشامدی ہے ..... کردار وضمیر کے ہر سانچے میں ڈھل جاتا ہے ..... اس کی اپنی کوئی شخصیت ہے نہ چھاپ، اصول نہ عقیدہ۔

لیکن یہ سب کہنے کی باتیں ہیں اور آپ جانتے ہیں کہ انسان جب باتیں کرنے پر آتا ہے تو سطحی سے سطحی موضوع پر بھی گہری سے گہری باتیں کر سکتا ہے واقعہ یہ ہے کہ "ابن الوقت" سمجھنے کی چیز ہی نہیں۔ جو سمجھ میں آگیا وہ "ابن الوقت" کیسا؟

"ابن الوقت" جس روز سمجھ میں آگیا۔ یہ سمجھئے کہ ختم ہو گیا ___ کیا ___ ادراک کی سرحد جہاں ختم ہوتی ہے "ابن الوقت" وہاں سے شروع ہوتا ہے سچ پوچھیئے تو "ابن الوقت" کو خود بھی معلوم نہیں کہ وہ کیا ہے؟ یہ دراصل ایک نہایت نازک سے توازن کا مسئلہ ہے۔ لوگ توازن کھو بیٹھے، پہچانے گئے، جنھوں نے سلیقے سے کام لیا وہ بسا اوقات اپنے وقت کے اکابرین میں شامل ہو گئے۔

ادیب و شاعر کی طرح "ابن الوقت" بھی پیدا ہوتا ہے، بنایا نہیں جا سکتا۔ بنایا جائے تو کچھ مزیدار سا نہیں بنتا۔ شاعر کم اور عالم زیادہ بن جاتا ہے۔ عشق و ریاضت سے نکھرتا ہے۔ پھر جس طرح ادب اعلیٰ درمیانہ اور گھٹیا ہوتا ہے۔ بعینہٖ "ابن الوقت" بھی اعلیٰ، درمیانہ اور گھٹیا ہوتا ہے۔ کبھی ناول کی طرح طویل، کبھی رباعی کی صورت مختصر اور کبھی تو بالکل استعارہ ہی استعارہ۔ دریا بہ حباب اندر، لچک کا یہ عالم کہ "ابن الوقت" کا ترجمہ ہی شاید لچک ہو۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ادیب زندگی تخلیق کرتا ہے اور "ابن الوقت" اس کو برتتا ہے۔ شاعر بھو کا مرتا ہے "ابن الوقت" مزے کرتا ہے۔

بعض لوگ "ابن الوقت" کو بھاپ بجلی کے زمانے کی پیداوار سمجھتے ہیں وہ اپنی سرشت میں بھاپ اور بجلی ضرور ہے لیکن بھاپ بجلی کے زمانے کی پیداوار ہرگز نہیں ___ "ابن الوقت" کا شجرۂ نسب خود وقت ہی کے شجر سے پھوٹتا ہے دونوں کی تاریخ پیدائش قریب قریب ایک ہے۔ جب سے وقت ہے "ابن الوقت" بھی ہے۔ البتہ پہلے شاید زمین سے آہستہ آہستہ اگتا ہو۔ اب مشین میں ڈھلتا ہے ___ وقت اچھے تھے تو "ابن الوقت بھی نجیب الطرفین تھے۔ جیسا وقت ویسا "ابن الوقت" برق اور ایٹم کے

دور میں پتھر اور دھات کا "ابن الوقت" کہاں۔

بادشاہ سلامت کے بٹیر کو جو لوگ "رستم و افراسیاب"، کہتے تھے اور بڑے بڑے پہلوانوں کی دستار فضیلت اتار کر بٹیر کے سر باندھ دیتے تھے وہ احمق نہ تھے۔ اپنے وقت کے نہایت ذہین اور کامیاب "ابن الوقت" تھے۔ چنانچہ تذکروں میں ہم دیکھتے ہیں کہ رستم و افراسیاب اپنی جگہ "رستم و افراسیاب اور بٹیر بٹیر ہی رہے البتہ "ابن الوقت" جتنے روز جیے ٹھاٹھ کر گئے۔ اب نہ وہ والے بادشاہ اور نہ وہ موتیوں والے بٹیر، نہ وہ سادہ و معصوم "ابن الوقت"!

خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہوگئیں

بادشاہ ابن الوقت اور بٹیر کا قصہ بھی عجیب ہے۔ معلوم ہوتا ہے تینوں ایک دوسرے کے بطن سے نکلے ہیں۔ ایک دوسرے کے بعد زندہ نہیں رہتے۔ رہتے ہیں تو کچھ "بیوہ" سے ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ جب سے بادشاہ اٹھ گئے ہیں۔ بٹیر بھی اڑ گئے ہیں — "ابن الوقت" نسبتاً زیادہ جاندار نکلا کچھ انڈر گراؤنڈ چلے گئے، جو ذرا سمجھ دار تھے۔ انہوں نے جب دیکھا کہ —— ساقی نے بنا کی روش لطف و کرم اور تو وہ دفتروں اور کارخانوں میں ملازم ہو گئے، صنعت، تجارت اور سیاست کے کوچوں میں جا نکلے۔ یہ دیکھ کر بادشاہ اور بٹیر بھی بھیس بدل کر واپس آگئے۔ صورت بدل گئی تھی، سیرت دی تھی۔ وہی بادشاہ وہی بٹیر اور وہی ابن الوقت!

نہ میں بدلا نہ دل بدلا نہ دل کی آرزو بدلی!
میں کیسے اعتبار گردش دور زماں کر لوں

میں تاریخ کی کسی عالمانہ بحث کا اہل نہیں ہوں مگر کچھ ایسا محسوس کرتا ہوں

کہ دنیا کے بیشتر بادشاہوں کی تاریخ اصل میں "ابن الوقت" اور "بٹیر" کی تاریخ ہے۔ جن چند بادشاہوں نے اپنی تاریخ خود پیدا کی ہے ان کو "ابن الوقت" چھوڑ گئے یا بصورت دیگر بادشاہوں کو تخت و تاج چھوڑنا پڑا۔ بعض اوقات تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ اگر "ابن الوقت" نہ ہوتا تو شاید دوسرے سے کوئی تاریخ ہی نہ ہوتی تاریخ نہ ہوتی تو فلسفہ کہاں ہوتا؟ فلسفہ نہ ہوتا تو... بہرحال اس بحث کو میں ذرا بعد پر اٹھا رکھتا ہوں ـــــ کیونکہ اگر بحث طول پکڑ گئی تو صرف تاریخ رہ جائے گی اور "ابن الوقت" نکل جائے گا۔

یہاں ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان تینوں میں سب سے اہم کون ہے؟ ـــــ بادشاہ ـــــ ابن الوقت یا بٹیر؟ بدیہی جواب تو یہی ہوگا کہ بادشاہ لیکن صاحب ہر چیز جو چمکتی ہے سونا نہیں ہوتی ـــــ ذرا ایک لمحے کے لئے یہ نقشہ تو ذہن میں جمائیے کہ بادشاہ سلامت اجلاس فرما رہے ہیں سامنے زرق برق پیچوان لگا ہے ـــــ ظل سبحانی کش لگا کر ادھر ادھر خلا میں کش لگا رہے ہیں مگر کوئی اداشناس موجود نہیں ہے جو حقے کا بٹیر بنا دے ـــــ یعنی ایک ایک کش پر دو دو مرتبہ اٹھے تین تین مرتبہ کورنش بجا لائے پھر ہاتھ جوڑ کر عرض کرے کہ خداوند کے خمیرے کی خوشبو سے روم اور چین کی وسعتیں بھر گئی ہیں... سلطان اعظم نے دیوان خاص کے ایک گوشے پر ایک عام نظر ڈالی ہے لیکن کوئی نہیں جو نوبت کی چوٹ پر اعلان کر دے کہ پورے شہر میں موتیوں کا مینہ برس گیا ہے ـــــ غور فرمائیے یہ بادشاہ تو نہ ہوا۔ بٹیر ہوا زیادہ سے زیادہ کوئی خوشحال مزدور ہے جو فتوحات کی مشق میں گرفتار ہے۔ تاج و تخت پر لات مار کر درویشی و گوشہ نشینی اختیار کرنے والے بادشاہ غالباً وہی بادشاہ تھے جن

کو "ابن الوقت" اور بٹیر میتسر نہ تھے۔

ویسے بادشاہ ابن الوقت اور بٹیر اپنے اپنے مقام پر ایک دوسرے کو بٹیر سمجھتے ہیں اور کچھ غلط نہیں سمجھتے۔ کیونکہ جس آدمی کو بھی کھرچا جائے۔ ایک سطح پر جا کر ضرور اندر سے بٹیر نکلتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ بعض لوگ اس کا گلا گھونٹ دیتے ہیں۔ لوگ آخر خودکشی بھی تو کر لیتے ہیں۔؟

"ابن الوقت" کا بٹیر پرندہ نہیں کہ لازمی طور پر نظر ہی آئے یہ تو زندگی کی کی طرف ایک خاص زاویئے سے دیکھنے کا نام ہے جس کی سب سے بڑی اور غالباً واحد خصوصیت یہ ہے کہ یہ زاویہ وقت اور زندگی کے ساتھ ساتھ چلتا اور بدلتا جاتا ہے۔

یہاں ایک واقعہ یاد آ گیا — ایک دفتر کے افسر اعلیٰ نے بڑی بڑی مونچھیں رکھ لیں — لوگ سمجھے یہ شخص تو شاید سالانہ رپورٹ بھی مونچھوں کی طول بلد ناپ کر لکھے — نتیجہ یہ ہوا کہ پورے محکمے میں ایک سے ایک لمبی مونچھ لہرانے لگی۔ ایک صاحب خیر سے کچھ ادیب تھے بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ ادب کے "ابن الوقت" تھے کیونکہ زندگی کے ہر شعبے میں "ابن الوقت" ہوتے ہیں انہوں نے تو ستم ظریفی کی حد کر دی یعنی مونچھوں کے فوائد و فضائل پر سوسوا سو صفحے کی ایک پوری کتاب لکھ ماری۔ باہر سرورق پر لارڈ کچنر کی تصویر تھی۔ تصویر بھی کیا تھی؟ مونچھیں ہی مونچھیں تھیں اور کتاب کے اندر طب و تاریخ کے حوالوں سے ثابت کیا گیا تھا کہ انسانی عظمت ہمیشہ مونچھوں کے پیچھے پیچھے چلتی رہی ہے۔ جن لوگوں نے مونچھ کے بغیر نام پیدا کیا۔ ان کی عظمت اتفاقی تھی۔ عارضی تھی — نامکمل تھی — مصنف کے قول کے مطابق اگر نپولین کی مونچھیں ہوتیں تو وہ یقیناً ساری دنیا کو فتح کر لیتا اور سکندر اعظم کو تو

بیا اس سے لوٹنا ہی اس لئے پڑا کہ بے چارے کی مونچھیں نہ تھیں۔

کچھ پرانے زمانے ہی پر موقوف نہیں مونچھوں کا سلسلہ، فیضان اب بھی جاری ہے مصنف کی رائے میں ہٹلر کی ابتدائی کامیابیوں کا باعث اس کی مونچھ ہی تھی ——— جتنی مونچھ تھی اتنی ہی کامیابی تھی ——— سٹالین کی مونچھ بڑی تھی میدان بھی اسی کے ہاتھ رہا۔ ان کے نزدیک دوسری جنگ عالمگیر دراصل دو مونچھوں کی لڑائی تھی جس میں بڑی مونچھ نے چھوٹی کو شکست دی۔

الغرض اس طرح انہوں نے افسر کی مونچھ کو اپنا "بٹیر" بنالیا۔

تالی ہمیشہ دو ہاتھوں سے بجتی ہے۔ یہ فن بھی اپنے سرپرستوں ہی کے دم قدم سے زندہ ہے تصویر کا یہ رخ بھی دیدنی ہے دلی نعمت آٹھ دس ہزار میل دور سے ٹیلیفون پر بات کر رہے ہیں "ابن الوقت" نے ریسیور اٹھاتے ہی کہا ——— نصیب دشمناں بندگان عالی کی آواز کچھ بھاری سی معلوم ہوتی ہے ——— اور بندگان عالی کو سچ مچ زکام ہو گیا۔

یہ تو سامنے کی موٹی موٹی مثالیں تھیں ورنہ اہل کمال نے اس فن کو زمین سے آسمان پر پہنچا دیا ہے۔ وہ ندرتیں اور باریکیاں پیدا کی ہیں کہ بقول غالب

لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

لیکن کتنی عجیب بات ہے کہ "ابن الوقت" کو تو ایک دنیا برا کہتی ہے اور "سرپرست" کو کوئی کچھ نہیں کہتا۔ حالانکہ اگر مسخرے ہیں تو دونوں ورنہ کوئی نہیں کیا یہ بھی ایک قسم کی "ابن الوقتی" ہی تو نہیں؟

میں تو بعض اوقات سوچتا ہوں کہ زمانے نے "ابن الوقت" کے ساتھ منصفی

کا سلوک نہیں کیا   تعجب ہے کہ قائل تک کو ہمدردانہ نقطۂ نگاہ سے دیکھا جا سکتا ہے مگر "ابن الوقت" کے نقطۂ نگاہ کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی جاتی۔ حالانکہ "ابن الوقت" سوسائٹی کے بعض طبقوں کے لئے پانی اور ہوا کی طرح ضروری ہے   ذرا تاریخ پر پھر ایک نظر ڈالیئے اور انصاف سے فرمایئے کہ اس کے جتنے ٹکڑے عبرت یا اختلاج قلب کے بغیر پڑھے جا سکتے ہیں وہ کن لوگوں کی داستان ہیں؟

دوسرے کے نقطۂ نگاہ کو سمجھنا اور اس کا احترام کرنا کیا خوبی نہیں ہے؟ اس شعبے میں "ابن الوقت" کا ریکارڈ اتنا شاندار ہے کہ کوئی دوسرا فرد یا ادارہ اس کی گرد کو بھی نہیں پا سکتا۔ حیرت ہے کہ لوگ اس خوبی کو بھی الٹا نقص قرار دیتے ہیں الزام یہ ہے کہ وہ دوسرے کے نقطۂ نگاہ کا بہت زیادہ احترام کرتا ہے۔ سبحان اللہ یہ تو بالکل ایسی ہی بات ہوئی جیسے کوئی کہے کہ دنیا میں بہت زیادہ امن قائم ہو گیا ہے!

اب "ابن الوقت" کا ایک بہت بڑا قصور یہ بتایا جاتا ہے کہ وہ زندگی کے خلاف لڑنے سے گریز کرتا ہے لیکن یہ کوئی نہیں دیکھتا کہ وہ خود اپنے خلاف کس بے جگری سے لڑتا ہے۔ ظاہر ہے کہ دوسرے کے خلاف لڑنے کے بجائے اپنے آپ کو لہولہان کرنا زیادہ مشکل ہے اور شاید.... عجیب تر بھی۔

میں تو یہاں تک بھی کہنے کو تیار ہوں کہ ابن الوقت مرنے کی نہیں جینے کی لڑائی لڑتا ہے ویسے اس نے اصولاً کشت و خون کو ہمیشہ روکا اور حسن و زیبائش، آسائش و کشادگی اور ذائقہ و لذت کو فروغ دیا ہے وہ گولی کا زخم نہیں باغ کا پھول ہے۔ پھول سے آخر لڑنے کی توقع ہی کیوں کی جائے؟ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ آج تک کوئی "ابن الوقت"

خون خرابے کا باعث نہیں ہوا۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ اس قسم کا "ابن الوقت" کوئی گھٹیا "ابن الوقت" ہوگا۔ ابوالہوس آخر کس پیشے میں نہیں! مناسب تو یہی تھا کہ مساعی قیام امن کے اعتراف میں "ابن الوقت" کا شکریہ ادا کیا جاتا لیکن مرزا نے سچ ہی کہا تھا:

ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو برا کہتے ہیں

خود ادب اور لٹریچر پر "ابن الوقت" کے بے شمار احسانات ہیں اکثر و بیشتر ملک الشعراء کون بزرگوار تھے؟ آدمی وہ کیسے بھی ہوں یہ بتایئے کہ کیسا کیسا تابدار شعر وہ دنیا کو دے گئے ہیں؟ اور جو شخص تہذیب و آدمیت کا اتنا بیش بہا ورثہ چھوڑ جائے وہ خود بنیادی طور پر گھٹیا آدمی کیونکر ہوا؟ قصور وقت کا ہے "ابن الوقت" کا نہیں!

داستانوں کے کتنے چٹخارے جن سے زندگی کی ہزاروں خوبصورتیاں اور لذتیں وابستہ ہیں کس نے مہیا کی ہیں؟ یہ ٹھیک ہے کہ "ابن الوقت" مسائل حیات کو حل نہیں کرتا لیکن یہ بھی دراصل اس کے ساتھ زیادتی ہے جب وہ مسائل پیدا ہی نہیں کرتا تو حل کیوں کرے؟ دوسروں کی پاداش وہ کیوں بھگتے؟ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ "ابن الوقت" احمق نہیں ہوتا۔ وہ تو محبت تک کی قیمت وصول کر لیتا ہے۔

مولوی ڈاکٹر نذیر احمد عظیم ناول "ابن الوقت" کو "جو ابدیت" نصیب ہوتی ہے وہ اُردو کی بہت کم کتابوں کے حصے میں آئی ہے۔ یہ ناول کس کے خون جگر سے لکھا گیا تھا؟ میں تو کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ "ابن الوقت" نہ ہوتا تو کچھ عجب نہ ہوتا کہ اُردو ادب اس ناول سے بلکہ خود مولوی ڈاکٹر نذیر احمد ہی سے محروم رہ جاتا؟ اور یہ کتنا

بڑا تہذیبی زیان ہوتا؟

"ابن الوقت" کی بد قسمتی اصل میں یہ ہے کہ وہ اپنی تاریخ لکھنے کے بجائے دوسروں کی تاریخ لکھتا رہا ہے۔ اپنی تاریخ خود لکھ گیا ہوتا تو دنیا آج اسکی خوبیوں کا بھی اندازہ کر سکتی لیکن بہر حال اہل نظر تو جانتے ہیں کہ وقت کی تاریخ ابن الوقت ہی کی تاریخ ہے۔

"ابن الوقت" کے تذکرے میں سنجیدہ ہونے کی گنجائش ہے نہ ضرورت! یہ خود "ابن الوقت" کی روایات کے خلاف ہے لیکن ایک بات میں پوری سنجیدگی سے کہنا چاہتا ہوں خواہ آپ کو میری سنجیدگی پر ہنسی ہی کیوں نہ آجائے؟ لوگ "ابن الوقت" کو اس شدت و کثرت سے کوستے ہیں ہیں؟ مجھے تو یہ کچھ رواجی اور رسمی سی بات معلوم ہوتی ہے۔ کیا اس پردے میں خود اپنا دفاع تو مطلوب نہیں ہوتا؟ میں نے تو جب کبھی "ابن الوقت" کو لعن طعن کرنا چاہا۔ معاً خود اپنے اندر کوئی بٹیر پھڑپھڑانے لگا۔ کوئی بادشاہ سلامت ٹہلتے ٹہلتے اچانک سامنے آگئے ——— سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا!

خاندان کیخسرو

سلطان راجہ مبارز خان حکمرانوں کے ایک معزول بلکہ اب دو صدیوں سے تو گویا مفلوج کیجنسر و خاندان کے چشم و چراغ ہیں یہ "چشم و چراغ" ہیں نے یونہی ازراہ اخلاق و مروت ہی نہیں کہہ دیا بلکہ وہ لفظاً و معناً یعنی کیا محاورہ اور کیا روزمرہ ہر لحاظ سے اپنے خانوادے کے چشم و چراغ واقع ہوئے ہیں۔

مثلاً چشم کو لیجئے اور اتفاق دیکھئے کہ سلطان مبارز خان صرف ایک ہی چشم رکھتے ہیں۔ مدت ہوئی جنگل ہیں ایک نو آموز عقاب کو ——— "جھپٹ کر پلٹنے اور پلٹ کر جھپٹنے" کی مشق کرا رہے تھے کہ نامراد پلٹ کر سلطان صاحب کی پوری ڈھیلے پتلی سمیت صاف کر گیا۔ لوگوں نے پتھر کا ڈھیلا ڈلوانے کی رائے دی مگر پتھر کی آنکھ ان کے مذاق لطیف پر گراں گزری۔ بعض ڈاکٹروں نے یورپ جانے کا مشورہ دیا کہ شاید وہاں کے ماہرین کسی مردہ انسان کی کوئی ایسی نیم مردہ آنکھ ڈال دیں جو تھوڑا بہت دیکھ بھی سکتی ہو۔ لیکن سلطان مبارز خان اس پر بھی آمادہ نہ ہو سکے۔ ایک تو نہیں

سرے سے سفر کے خیال ہی سے وحشت ہوتی تھی کہ ریل جہاز وغیرہ میں دوسرے لوگوں کے ہمراہ جمہوری طرز کا سفر کرنا انہیں سخت ناگوار تھا۔ پھر یورپ جا کر انسانی آنکھ ڈلوانے میں ایک بڑا خطرہ یہ بھی تھا کہ نہ معلوم کس خوانچہ فروش کی آنکھ ان کے سر تھوپ دی جائے جو خدانخواستہ ان کی زندگی کا زاویہ نظر ہی بدل کر رکھ دے۔

سوچ بچار کے بعد آخر طے پایا کہ حکمرانوں، کشورکشاؤں کو باز و عقاب کی آنکھ ہی کچھ زیب دے سکتی ہے۔ چنانچہ ہاتھ کے بدلے ہاتھ، ٹانگ کے بدلے ٹانگ کے اصول پر اسی عقاب کی آنکھ نکلوا کر ان کی آنکھ میں فٹ کر دی گئی۔ مگر یہ آنکھ دور سے صاف پہچانی جاتی ہے کہ باز کی آنکھ ہے کیونکہ ہر وقت باز رہتی ہے۔ کچھ یہ آنکھ، اس کے اوپر ان کی پھیلی ہوئی گمبھیر مونچھ، آدمی اگر کچھ زیادہ غور نہ کرے تو راجہ سلطان مبارز خان ایک اڑتا ہوا عقاب معلوم ہوتے ہیں اور چڑیا، فاختہ، کبوتر وغیرہ کی قبیل کے امن پسند پرندے تو سچ مچ ان کو دیکھتے ہی اڑ جاتے ہیں۔ البتہ کوّوں کو شاید پتہ چل گیا ہے کہ یہ باز کی مری ہوئی آنکھ ہے اور بازوں سے غالباً وہ خصومت بھی رکھتے ہیں کہ جب موقعہ ملتا ہے یمین و یسار سے اس آنکھ کر ٹھونگ مار جاتے ہیں۔ لہٰذا بیچارے سلطان مبارز خان دستار پر اکثر غلیل باندھ کر نکلتے ہیں۔

یہ تو تھی چشم ——— رہا چراغ تو گو زندگی کی چہل پہل کی شمع تو ان کے ہاں مدت سے گل پڑی ہے لیکن حویلی کے ایک تہ خانے میں جس کو توشہ خانہ کہتے ہیں، پیتل کا ایک چراغ پچھلی کئی صدیوں سے روشن ہے۔ روایت یہ ہے کہ خاندان کیخسرو کے مورثِ اعلیٰ سلطان راجہ ممارا خان نے بہرام پور کے ایک قلعے کی تعمیر یا تسخیر (اغلباً تسخیر کیونکہ تعمیر کی انہیں فرصت ذرا کم نصیب ہوئی) کی خوشی

میں یہ چراغ اپنے ہاتھ سے روشن کیا تھا۔ اور یہ وصیت بھی کی تھی کہ اس کو ہر گز کبھی بجھنے نہ دیا جائے۔ چراغ کے ساتھ سلطان مرحوم نے اپنی ایک شمشیر آبدار بھی توشہ خانہ میں رکھی تھی مگر چونکہ اس کے بارے میں کوئی وصیت کرنا بھول گئے تھے، لہذا شمشیر تو بعد میں کوئی مغل صوبے دار اٹھا کر لے گیا —— مزید بعد وہ ایک بھونسلہ سردار اور پھر لارڈ کارنوالس کے اردلی کی کمر میں دیکھی گئی ہاں چراغ آج تک برابر جل رہا ہے!

قلعہ بہرام پور کو اس خاندان کی تاریخ میں بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ ان کی تاریخ اصل میں چلتی ہی اسی قلعے سے ہے۔ مگر بد قسمتی سے قلعے کو کوئی خاص تاریخ نہیں نصیب ہو سکی۔ قیاس یہ ہے کہ ایک طوائف الملوکی ہیں، جو اس زمانے میں اکثر پھیلا کرتی تھی، یہ قلعہ سلطان ممارا خان کے ہاتھ پڑ گیا اور دوسری طوائف الملوکی میں ہاتھ سے نکل گیا اور یہ دوسری طوائف الملوکی کچھ ایسی بے قابو ہو کر پھیلی کہ اب اس قلعے کے آثار تک بھی کہیں نظر نہیں آتے ویسے لوگ کہتے ہیں کہ بڑا عالی شان قلعہ تھا۔ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس پرگنے میں بعض دوسرے قبائل کے جو دس بارہ قلعے آج تک موجود ہیں، یہ دراصل بہرام پور کے قلعے ہی کے دمدموں، کنگروں، برجوں اور دیواروں کو اکھاڑ کر بنائے گئے تھے۔ اور یہ خیال قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کیونکہ یہ سب قلعے وضع قطع میں خلیرے، ممیرے، پھپیرے بھائی نظر آتے ہیں —— قلعے کی بنیادیں جو پتھر تھے، ان سے پہلے تو بہرام پور کے لوگوں نے اپنے مکان بنوائے بعد میں وہی پتھر ان کی قبروں پہ صرف ہوتے اور آج نہ بہرام کا قلعہ موجود ہے، نہ وہ قصبہ، نہ وہ لوگ، نہ ان کی قبریں۔

کیخسرو خاناں قلعے سے ہتھیلی پر جلتا ہوا چراغ رکھ کر بھاگا تو نہ معلوم کہاں کہاں گھومتا ہوا پایان کار اس حویلی میں پناہ گزیں ہوا، جو اصلاً تو ایک عظیم قلعہ نما حویلی تھی مگر اب عرصے سے اس کا اصطبل ہی قابل رہائش رہ گیا تھا جس میں وقتاً فوقتاً جا بجا دیواریں اٹھا کر، یا جہاں دیواریں نہ اٹھ سکیں وہاں ٹاٹ تان کر زنان خانے، دیوان خانے، توشہ خانے، ہاتھی خانے، وزیر، ڈیوڑھیاں اور غلام گردشیں وغیرہ بنالی گئی ہیں۔

معزولی کے وقت پہلے سلطان کو معقول موروثی پنشن کے ساتھ کچھ زرعی جاگیریں بھی ملی تھیں، مگر کئی نسلوں کی تقسیم و تفریق کے بعد اب یہ آمدنی محض ایک علامتی امتیاز رہ گئی جو ہرگز اس لائق نہیں کہ "وضع سلطانی" کے بوجھ کو جو ہاتھیوں سے نہیں اٹھتا، سنبھال سکے مگر بوڑھا سلطان مبارز خان اسی بوجھ کو سر کا تاج سمجھتا ہے۔

محل ڈھیر ہو چکا لیکن ڈیوڑھی پر چوبدار کھڑا ہے۔ مصاحب کوئی نہیں مگر دیوان عام موجود ہے۔ یہی نہیں بلکہ نشست و برخاست کے جو قواعد سلطان راجہ مہاراخان کے وقت بندھ گئے تھے، ان معمولات پر آج بھی نہایت باقاعدگی سے عمل ہو رہا ہے۔ ادھر آفتاب سوا نیزے پر بلند ہوا (یہ معلوم نہ ہو سکا کہ نیزہ لے کر آفتاب کو ناپتا کون ہے) ادھر آپ محل سرا سے سوا جریب چل کر دالان کے ایک چبوترے پر رونق افروز ہو گئے۔ سامنے پیچوان رکھا ہے اور بازو میں ایک طشت کے اندر کلیجی کی بھنی چند بوٹیاں، مونگ پھلی کے مغز، باجرہ، سونف اور مصری وغیرہ کے علاوہ سبز چارے کی چند چھوٹی چھوٹی گڈیاں رکھی ہیں، سلطان صاحب نے

حقے کے دو کش لے کر آواز دی۔

"وزیر ڈیوڑھی"

اور مولوی اللہ بخش جو مسجد میں امامت بھی کرتے ہیں، ڈیوڑھی کی ایک بغلی کوٹھڑی میں سے نکل کر دست بستہ حاضر ہو گئے۔

"کوئی عرضی پیشی؟" سلطان نے پوچھا۔

"حضور سب خیریت ہے" وزیر ڈیوڑھی نے ہاتھ جوڑ کر جواب دیا۔ اور سامنے بچھی ہوئی چارپائی پر بیٹھ گئے"

"میر شکار"

اس آواز پر میر شکار جو دراصل نذرو مراثی ہے، ہاتھ کے انگوٹھے پر باز بٹھائے آگیا۔ سلطان نے باز کے سر پر دست شفقت پھیرا اور طشت میں سے کلیجی کا ایک ٹکڑا اٹھا کر باز کی چونچ میں رکھ دیا۔ باز کو کھونٹی سے باندھ کر تھوڑی دیر میں وہی نذرو مراثی داروغہ اصطبل کی حیثیت میں سلطان کے سمر قندی ٹٹو کو باگ سے پکڑ لایا۔ جس کو انہوں نے اپنے ہاتھ سے سبز چارے کی ایک گڈی کھلائی اسی طرح پھر یکے بعد دیگرے محل کے طوطے، بٹیر، مرغ اور بکریاں سلام کو حاضر ہوئیں اور اپنے اپنے حصے کا چارہ دانہ لے گئیں۔

اب چار ساعتیں آفتاب کی طرف تکنے کے بعد یہ آفتاب کے کسی زاویے پر منحصر ہے کہ آپ چبوترے سے اٹھ کر دیوان خاص میں جائیں گے، توشہ خانے میں یا واپس محل سرا میں۔

حویلی سے باہر آپ شاذ ہی قدم رکھتے ہیں۔ ایک تو وہ اس بات کو خوب سمجھتے ہیں کہ: ع نکل کر پھول سے خوشبو ذلیل و خوار ہوتی ہے

ـــــــ اور دوسری بڑی قیامت یہ ہے کہ ان کے بزرگ ہاتھیوں پر نکلتے تھے پھر چار گھوڑوں کی فٹن پر نکلتے رہے۔ رفتہ رفتہ چار کے دو گھوڑے رہ گئے۔ اور اب سلطان صاحب کے پاس جو سمر قندی ٹٹو ہے۔ وہ مجذوبیت، کے اس مقام پر ہے کہ اگر فٹن اس کو کھینچ کر لے جائے۔ پھر خود فٹن کا بھی یہ حلیہ کہ اگر آپ اس میں بیٹھ کر نکلیں تو یوں معلوم ہو گویا کسی عاشق کا جنازہ دھوم سے نکل رہا ہے۔

توشہ خانہ تو ہاتھی خانے کی طرح شاید خالی پڑا ہے۔ البتہ دیوان خاص کی بعض چیزیں قابل ذکر ہیں۔

مخملیں غلاف میں ایک بہت بڑی منقش، مجلاّ و مطلاّ کتاب رکھی ہے جس میں سلطان مماراخان سے لے کر آج تک کے جملہ سلاطین کے روزنامچے درج ہیں۔ ابتدائی دور کے روزنامچے تلواروں اور یلغاروں کے تذکرے سے لبریز ہیں۔ تلوار ہر وقت نیام سے باہر رہتی تھی۔ نیام میں غالباً راشن بھرا رہتا تھا۔ شہسواری کا یہ عالم تھا کہ دوڑتے گھوڑے کی پشت پر سو رہے ہیں اور گھوڑا میدان مار کر قلعہ میں واپس بھی آگیا۔ ایک سلطان نے محمد غوری کے تعاقب میں گھوڑا ڈالا تو حالانکہ محمد غوری ابھی جہلم کی پہاڑیوں میں کہیں بھٹک رہا تھا کہ سلطان غزنی پہنچ کر قتل بھی ہو چکا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ محمد غوری بھی بچ کر نہ جا سکا۔ کیونکہ اس کو ادھر کے ایک "کے گوہر" قبیلہ نے کیخسرو سلطان کے شبہ میں قتل کر دیا۔

دوسرا دور شورشوں، خانہ جنگیوں اور طوائف الملوکی کا دور تھا۔ کیخسرو سلاطین اس زمانے میں کبھی دشمنوں سے اور کبھی خود اپنے آپ سے لڑتے رہے۔ اس دور میں کوئی دس پندرہ چچے اپنے بھتیجوں کے ہاتھوں قتل ہوئے چنانچہ بھتیجوں نے چچا بننے

کے خوف سے بعد میں اپنے بھائیوں کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ مصروفیت کا پیکار اور فتح و شکست کی بے یقینی کا یہ عالم تھا کہ رانیوں کو میدان جنگ میں ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ فتح ہوتی تو دوسروں کی رانیاں گھر میں ڈال لیتے۔ اولاد نرینہ کا سلسلہ عموماً دشمن رانیوں ہی کے بطن سے قائم رہا۔

ہاتھی، شیر، چیتے، عقاب وغیرہ کے شکار کے رسیا تھے۔

تیسرے دور میں اگرچہ معرکہ جوئی کا ولولہ تو سرد پڑ چکا تھا اور دوڑتے ہوئے گھوڑے کی پشت پر اگر سونے کی کوشش کرتے تھے تو گر پڑتے تھے۔ تاہم ہنوز خاصہ دم باقی تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب پنجاب میں سکھوں کا "طوطا" بول رہا تھا۔ سکھوں سے ابتداً ان کے تعلقات کافی خوشگوار تھے۔ مگر پھر ایک ذراسی غلط فہمی پر ان سے جنگ چھڑ گئی۔ قصہ یوں ہوا کہ ٹہل سنگھ یا میوہ سنگھ نامی ایک جرنیل مع لشکر، ان کے ہاں اترا ہوا تھا کہ ان کے ایک سادہ لوح رکابدار نے مدامات کے طور پر حقہ لاکر اس کے سامنے رکھ دیا۔ اس پر وہ تلوار چلی کہ جب تلوار تھمی ہے تو اس علاقے پر انگریزوں کا تسلط قائم ہو چکا تھا۔ خاندان کیخسرو میں یہ لڑائی —— "حقوں کی لڑائی" کے نام سے مشہور ہے اس لحاظ سے دیکھا جائے تو انگریزوں کی کامیابی میں کیخسرو خاندان کے اس حقے کا بہت اہم حصہ ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ بعد میں بعض انگریز حکام چاندی، تانبے، پیتل وغیرہ کے چھوٹے چھوٹے حقے تحائف و یادگار کے طور پر اپنے ڈرائینگ روم میں رکھتے اور ولایت بھیجتے تھے۔

چوتھے دور میں، جو راجہ سلطان مبارز خان کے ساتھ ساتھ چل رہا ہے۔ روزنامچہ میں کچھ اس قسم کے اندراجات ملتے ہیں۔

"دن بھر پلنگ پر پڑے پڑے حقہ پیتا رہا۔"

"سلطان طہماسب خان کے کمر بند کو دیمک چاٹ گیا۔"

"مردان سے عمدہ نسوار منگوائی ہے۔"

"چترالی عقاب بیمار ہے۔"

"اس زور کی آندھی چلی کہ دیوان عام کی چھپت اڑ گئی۔"

"ہاضمہ سخت خراب ہے۔"

"کچھ بھی نہیں۔"

یہ اندراجات بھی سلطان مبارز خان کے ابتدائی روزنامچوں میں ملتے ہیں۔ ورنہ بعد میں تو انہوں نے اپنے شاہی روزنامچہ میں دوروں پر ادھر آنے والے افسروں سے ریمارکس اور سرٹیفکیٹ لکھوانے شروع کر دیتے ہیں۔ پونا ہارس کے ایک میجر ایل۔ بی۔ ڈبلیو ہڈسن صاحب سلطان مبارز خان کی مونچھوں، ان کی حویلی کی محرابوں، باز کی ٹانگوں میں بندھے ہوئے گھنگھروں اور ان کے باورچی خانے کی تعریف میں پورے دو صفحات لکھ گئے ہیں۔ آخری ریمارک ایک سب ڈویژنل افسر مسٹر ایلن بارٹلے کا لکھا ہوا ہے جس پر یکم اپریل، ۱۹۴۷ء کی تاریخ ثبت ہے۔ آزادی کے بعد سے روزنامچہ خالی پڑا ہے۔ سلطان مبارز خان کہتے ہیں کہ اب ہم ریمارک لکھوائیں تو کس سے لکھوائیں۔ جو افسر آتا ہے وہ پہلے کبھی نہ کبھی اسی علاقے میں قانونگو، گرداور، تحصیلدار، تھانے دار رہ گیا ہے رہے بڑے سینئر افسر تو وہ نہ معلوم کس افراتفری میں مبتلا ہیں کہ دورے پر کبھی اس طرف آتے ہی نہیں آتے ہیں تو انہیں شکار کھیلنے کا شوق نہ روزنامچہ لکھنے کی فرصت۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ہمیں ان سے ریمارک لکھواتے ہوئے

کچھ شرم سی آتی ہے۔

مجموعی حیثیت سے اگر تاریخی واقعات کی اوسط فی صدی نکالی جائے تو معلوم ہوگا کہ اس مسلمان خاندان کے سلاطین اکثر و بیشتر دوسرے مسلمان سلاطین کے خلاف نبرد آزما رہے ہیں۔

باز و عقاب سے شکار کھیلنا کیخسرو خاندان کا مرغوب مشغلہ رہا ہے۔ آج بھی کوئی بیس پچیس نامی گرامی عقاب، جن کی کھال میں بھوسہ بھرا ہوا ہے۔ دیوانِ خاص کی دیواروں پر جا بجا بیٹھے نظر آتے ہیں۔ ہر عقاب کے نیچے ایک تختی لگی ہے جس پر خط نسخ کوفی میں فارسی کا کوئی مشکل سا شعر کندہ ہے اور اس کے نیچے مرحوم عقاب کی مختصر سی سوانح عمری ـــــــ آخری عقاب وہ ہے جس کی آنکھ نکلوا کر خود سلطان مبارز خان نے اپنی آنکھ میں فٹ کروا رکھی ہے۔

دیوان خاص میں آبنوس کا ایک بہت بڑا چوبی بورڈ آویزاں ہے جس پر عہد بعہد کے مصوروں نے سلاطین کیخسرو کی تصاویر بنا رکھی ہیں۔ مورث اعلیٰ سلطان ممار اخان کی تو قد آدم تصویر موجود ہے۔ مگر باقی سلاطین کے گردن تک صرف چہرے ہی دکھلائے گئے ہیں لیکن اس سے تصویر میں کوئی خاص کمی نظر نہیں آتی کیونکہ بعد کے تمام سلاطین وہی سلطان ممار اخان کا چغہ، کمر بند اور پاجامہ پہنتے تھے۔

چہروں میں بھی مصوروں نے زیادہ کمال مونچھوں پر صرف کیا ہے، کہ مونچھ اس خاندان کی قومی و تاریخی علامت سمجھی جاتی ہے۔ چنانچہ تصاویر کا یہ بورڈ عملاً گویا مونچھوں کا ایک کیلنڈر ہے جس میں بڑی بڑی جابر، گھنی اور گھمبیر، بلند و بالا مونچھیں نظر آتی ہیں۔ بعض سلاطین کے بارے میں تو یہ مشہور ہے کہ وہ مونچھوں کے دونوں کونوں

پر الگ الگ دو تلواریں لٹکا کر چلا کرتے تھے۔ داناؤں کا کہنا ہے کہ ان مونچھوں کے طول بلد اور عرض بلد سے خاندان کیخسرو کے عروج و زوال کی تاریخ مرتب کی جا سکتی ہے۔ جن سلاطین کی مونچھیں شاندار تھیں۔ ان کا دور حکومت بھی شاندار ثابت ہوا خود بوڑھے سلطان مبارز خان کی مونچھیں دیکھ کر آدمی دنگ رہ جاتا ہے کہ اس پیری و ضعیفی میں اتنی گنجان مونچھیں یہ کہاں سے لائے ہیں اور اتنے نحیف و نزار جسم کے ساتھ اتنا بوجھ لے کر کس طرح چلتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر سلطان مبارز خان کو ترازو کے ایک پلڑے میں رکھا جائے اور ان کی مونچھوں کو دوسرے میں، تو مونچھوں والا پلڑا شاید کچھ بھاری ہی نکلے۔ بہرحال ان کی مونچھیں گھنی بھی ہیں، گنجان بھی ہیں، اور ان کا رخ بھی ہنوز اوپر کی طرف ہے اور سلطان مبارز خان خوش ہیں کیونکہ خاندان کا ستارۂ عروج انہیں مونچھوں سے بندھا ہوا ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ یہ ستارہ بلندی کی طرف جا رہا ہے۔

ہمارا پہلا مشاعرہ

مشاعرہ، ایک تقریب، ایک پروگرام، ایک تماشے کی حیثیت سے مختلف سامعین کے ذوق اور توفیق کی سطح پر، ہماری تہذیبی زندگی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ کوئی اس کا کم شوقین کوئی زیادہ۔ کوئی ٹکٹ بھر کر مشاعرہ دیکھتا، سنتا ہے کسی کی دلچسپی مفتا مفتی تک محدود ع

مفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے؟

کچھ لوگ طبعاً اور بعض لوگ اصولاً مشاعرے سے کتراتے ہیں۔ مثلاً ہمارے لالہ مصری خان گجر حالانکہ خود شاعر ہیں مگر مشاعرے کا نام سن کر خون ان کی رگوں میں جم جاتا ہے، کہا کرتے ہیں "میں بُرے شعر کو تو گوارا کر لیتا ہوں مگر مشاعرے میں شعر پڑھتے وقت بعض شاعروں کی شکلوں کا مسخ ہونا، میرے لئے ناقابل برداشت ہے۔"

ایک نحیف و نزار مگر بڑے نامی "مشاعرہ سٹار" شاعر کے بارے میں فرماتے۔ "جس جان کنی سے وہ اپنے مصرعوں کو اونچے سروں میں لے جاتے ہیں۔ ڈر لگتا ہے کہ خود بھی کسی مصرعے کے ساتھ نہ اڑ جائیں یا دفعتاً کمر سے ٹوٹ کر نہ گر پڑیں۔"

؎ موت ہے انہی اجزاء کا پریشان ہونا

مشاعرے سے ہمارا ذاتی رشتہ سکول کے زمانے میں قائم ہوا اور برابر بڑھتا چلا

گیا۔ عمر رفتہ کی طرف پلٹ کر دیکھتے ہیں (جس کی طرف ہم اکثر دیکھتے ہیں) تو نظر آتا ہے کہ ہم مشاعرے میں اور مشاعرہ ہم میں کچھ زیادہ ہی دخیل رہے ہیں۔ چنانچہ ہمارے بے تکلف احباب مع لالہ مصری خان بجر ہمیں شاعر کم اور مشاعرہ زیادہ سمجھتے ہیں اگرچہ ابھی تک مشاعرے سے ہمارے تعلقات یک قلم کشیدہ تو نہیں ہوئے لیکن کچھ عرصے سے ہمارے ترنم، کا شیرہ جس تیزی سے گاڑھا ہوتا جا رہا ہے اور الفاظ جس طرح ہمارے قابو سے باہر ہونے لگے ہیں، ڈر ہے کہ سامعین کسی روز ہمیں جبراً مشاعروں سے ریٹائر کر دیں گے یعنی کسی روز کسی مشاعرے میں

"جھانبڑ ادتے"

"چرڑی مار ادتے"

کے آوازے سننے پڑیں گے۔ مصیبت یہ ہے کہ شاعروں اور سیاست دانوں کو اکثر پتہ نہیں چلتا کہ لوگ ان کی پیروی کر رہے ہیں یا تعاقب ——! اصولاً تو مشاعرے سے ریٹائرمنٹ کا دن کسی شاعر کی زندگی کے مبارک ایام میں شمار ہونا چاہیئے کہ صحیح معنوں میں دراصل اسی روز اس کی شاعری کی روح، حلقہ جسم (قافیہ ردیف) کے شکنجے سے باہر نکلے گی اور وہ شعر سامعین کی بجائے اپنے لئے کہنے لگے گا تاہم از خود مشاعرے سے ریٹائر ہونے پر بھی طبیعت آسانی سے آمادہ نہیں ہوتی کہ آخر یہ بھی تو اظہار ذات کا ایک وسیلہ ہے مرزا غالب بھی کہہ گئے ہیں ؏

رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

مشاعروں کے ذکر پر ہمیں اپنی زندگی کا پہلا مشاعرہ یاد آگیا —— دیکھا ہوا مشاعرہ نہیں —— "کیا ہوا" مشاعرہ —— یہ ہمارے ہائی سکول کے عہد کی بات ہے۔ دسویں

جماعت تک پہنچتے پہنچتے ہمارے بارے میں دو باتیں زبان زدِ عام ہو چکی تھیں۔

- مشاعروں میں پاس
- امتحان میں فیل

سکول میں ان دنوں تین استاد اور آٹھ طالب علم شاعری کرتے تھے ہم طلبا کے ملک الشعراء تھے۔ ہمارے سکول میں ملک الشعراء کا منصب ایک باقاعدہ عہدہ تھا جو سال کے سال ہیڈ ماسٹر صاحب کی طرف سے "گزٹ" کیا جاتا۔ یہ عہدہ عموماً دسویں جماعت کے طالب علم کو ملا کرتا اور صرف ایک مرتبہ ع

یہ طور کا جلوہ ہے ہر بار نہیں ہوتا

ہماری باری آئی تو ہم تین طلباء باری باری تین تین مہینوں کے لئے ملک الشعراء گزٹ ہوئے۔ گرمیوں کی تعطیلات میں مدرسے کی عمارت کی طرح، ملک الشعراء کا عہدہ بھی خالی پڑا رہا۔۔۔۔ تین، ملک الشعراء کی ضرورت یوں ناگزیر ہوئی کہ تینوں نے غزل کے پرچے، میں ایک جتنے نمبر حاصل کر لئے۔ سکول کی انتظامیہ نے اتفاق کی برکتوں کو اجاگر کرنے کے لئے مناسب سمجھا کہ ایک نیام میں دو تلواریں نہیں سما سکتیں۔ مگر ہم سکول میں بیک وقت تین ملک الشعراء سمو کر دکھا دیں گے۔

سکول کی بزم ادب، کا مہینے کے مہینے ایک طرحی مشاعرہ برپا ہوتا۔ ملک الشعراء کی فوقیت یہ تھی کہ وہ سب سے آخر میں کلام، عطا فرماتا، ان مشاعروں میں گو شمولیت کی صلائے عام ہوتی مگر گنے چنے اہل ذوق ہی مشاعرہ سننے آتے "رائے عامہ" کے نزدیک ہم تین "ملک الشعراء" میں سے عبدالخلیل آتش کے شعر میں معنوی چمک زیادہ تھی ۔۔۔۔ میرا ترنم اچھا تھا ۔۔۔۔ اور راجہ جمشید عالم عیش کی صورت اچھی تھی۔

یہ ماہوار مشاعرے بھی گو اہم تھے مگر جس مشاعرے کو ہم اپنی زندگی کا پہلا مشاعرہ سمجھتے ہیں وہ سکول کے سالانہ جلسہ تقسیم انعامات کی تقریب میں برپا ہوا۔ ماہوار مشاعروں میں ہیڈ ماسٹر صاحب نہیں آتے تھے سالانہ مشاعرے میں پہلی مرتبہ ان کا سامنا کرنا پڑا مزید براں ایک انگریز ڈپٹی کمشنر مشاعرے کی صدارت کر رہا تھا۔ اساتذہ کے علاوہ شہر کے معززین بھی آج سامعین میں بیٹھے تھے اور ہمیں اس بات کا اندازہ اسی مشاعرے سے ہوا کہ ہمارے چھوٹے سے قصبے میں معززین کا کتنا عظیم جم غفیر موجود تھا۔ اس جم غفیر سے تو خیر ہم مرعوب کر بیٹھ لیتے مگر بجلی تو ناگاہ اس وقت گری جب ہم مطلع عرض کرنے کے لئے اٹھے اور دوسری صف میں ہمیں اپنے چچا جان اپنے مخصوص، کھونڈے، سمیت تشریف فرما نظر آئے۔ نہ جانے وہ کس وقت کس راستے سے جلسہ گاہ میں آ گئے تھے اور آج کیوں آ گئے تھے کہ وہ اس قسم کے جلسوں کو لہو و لعب کے صیغے کی چیز سمجھا کرتے اگر ہم ان کو پہلے دیکھ لیتے تو ہم پاؤں سر پر رکھ کر بھاگ لئے ہوتے مگر اب تو ہمارے لئے نہ جائے رفتن بنی نہ پائے ماندن — چچا جان کے سامنے ہماری روح اس لئے فنا رہتی تھی کہ ہمارے والد صاحب قبلہ کی ملائم طبعی کے باعث ہماری سرپرستی کی باگ دوڑ دراصل انہی چچا جان کے ہاتھ میں تھی اور وہ ہمارے جس مشغلے سے سب سے زیادہ الرجک تھے وہ کبوتر بازی کے بعد ہماری شاعری تھی ہم اس جرم کی پاداش میں بارہا ان کے "کھونڈے"، کی شدید ضربات سہہ چکے تھے۔ ابھی پچھلے ہفتے شاعری بالخصوص غزل گوئی سے کان پکڑوا کر توبہ کرائی تھی کہ آج پھر رنگے ہاتھوں پکڑے گئے۔ شومئی قسمت سے ہم اس وقت غزل ہی پڑھ رہے تھے جس کے تمام اشعار ایک الہڑ دوشیزہ کے چہرے، زلفوں اور بازوؤں وغیرہ کے گرد اس وضاحت سے منڈلا رہے تھے۔ کہ چچا جان ایک ایک شعر پر بے چینی کے

عالم میں کروٹ بدلتے جیسے وہ اس لڑکی کو صاف پہچان رہے ہوں اور گویا میں شعر نہیں کہہ رہا تھا اس کی آبروریزی کر رہا تھا۔

ہیڈ ماسٹر صاحب کے چہرے کا رنگ بھی بے ذہب تھا وہ طلبا کی شاعری کو مناظرِ قدرت سے باہر قدم نہیں رکھنے دیتے تھے۔ ہماری شاعری میں صرف اسی شام کا ذکر آسکتا تھا جو سورج کے غروب ہونے کے بعد آتی جاتی ہے وہ شام نہیں آسکتی تھی جو کسی حسینہ کی زلف کے کھل جانے سے حواس پر اترنے لگتی ہے اس قسم کی شام بلکہ صبح اور دوپہر بھی ہمارے لیے، آؤٹ آف باؤنڈ تھی ہم اگر کبھی غزل میں بھٹک جاتے اور اس کی بھنک ہیڈ ماسٹر صاحب کے کانوں تک پہنچ جاتی تو وہ دفتر میں بلوا کر اپنے مولا بخش سے ہماری وہ مرمت کرتے کہ ہمیں چھٹی کا دودھ یاد آجاتا ہم نے اس وقت تک ہر چند ابھی وادیٔ عشق میں عملاً قدم نہیں رکھا تھا مگر جوانی کی دہلیز پر تو قدم رکھ چکے تھے اور امرِ واقعہ یہ ہے کہ اس روز ہماری غزل کچھ زیادہ ہی جذبات کی سان پر چڑھ گئی تھی۔ چچا جان اور ہیڈ ماسٹر صاحب کے تیور دیکھ کر ہماری نظر اور ہمارا سر—یک زبان، ہو کر چکرانے لگا۔ کچھ سمجھ نہ آیا کہ ہماری زبان لڑکھڑا رہی تھی یا ہماری ٹانگیں سامعین کے چہرے سے کبھی ناگاہ پھیل کر چوڑے ہو جاتے اور کبھی پچک کر رہ گئے

جس طرح پانی کنوئیں کی تہہ میں تارا ہو گیا

اس نیم بے ہوشی کی حالت میں ایک مرتبہ جو ہیڈ ماسٹر صاحب اور چچا جان کے دو آتشہ چہروں پر نظر پڑی تو یوں لگا جیسے ہیڈ ماسٹر صاحب مولا بخش تول کر اٹھانا ہی چاہتے ہیں ہم اس وقت غزل کے چوتھے شعر پر تھے جس میں

کسی مہ وش کی زلف ہمارے شانوں پر کھلنے والی تھی۔

مگر ہم شعر کو ادھ پڑھا، اور زلف کو ادھ کھلا، چھوڑ کر بیٹھ گئے اور کئی دن گھر سے بھی روپوش رہے کہ عافیت اسی میں تھی۔

جائے کہ من بودم

معمولی پسنجر گاڑی، گرمیوں کا موسم اور پنجاب کی ایک ذیلی ریلوے لائن کا سفر درمیانے درجے کے ایک درمیانے سے ڈبے میں ہم پانچ مسافر آمنے سامنے بیٹھے تھے۔

میں پانچواں مسافر تھا۔ پہلے چار مسافروں کی گفتگو سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ جیسے طبقہ داری تقسیم کے تحت ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ دو گھی کے بیوپاری تھے اور گھی کے بیوپار میں اس طرح غرق تھے کہ اس کے سوا وہ گویا کچھ تھے ہی نہیں ع

آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

یوں معلوم ہوتا تھا جیسے گھر سے نہیں، گھی کے کنستر سے نکل کر سیدھے گاڑی میں آ گئے ہیں، سر کی سرخ ٹوپی سے لے کر، جواب صرف اوپر ہی اوپر سرخی مائل رہ گئی تھی۔ پیر کے روغنی جوتوں تک، ہر چیز گھی کی چکناہٹ میں شور بور تھی۔ یہ لوگ گھی خریدنے

لالہ موسیٰ جارہے تھے اور دنیا و مافیہا کو پس پشت ڈالے گھی کی ملاوٹوں میں مل چکے تھے گھی کے متعلق کوئی طبع زاد نکتہ ہاتھ نہ آتا تو لالہ موسیٰ کے کسی موٹے ارتھنی کو اس سے بھی زیادہ موٹی گالی دے کر دونوں زور کا قہقہہ لگاتے اور ایک دوسرے کے ہاتھ پہ ہاتھ بلکہ دو ہتر مارتے ہوئے اگلے سٹیشن پر چلے جاتے۔

ان سے ہٹ کر دو پڑھے لکھے خوش پوش مسافر سیر و سیاحت کی باتیں کر رہے تھے۔ یہ دونوں سرکاری وظیفے پر تین تین مہینے کے لیے بیرونی ملکوں سے ہو آئے تھے مگر اس طرح کہ ایک نے صرف امریکہ دیکھا تھا اور دوسرے نے جو کچھ دیکھا تھا اس میں سے صرف پیرس یاد رہ گیا تھا۔ ایک امریکہ کا مداح تھا دوسرا فرانس کا معترف۔ بالخصوص امریکہ والے کو امریکہ اس قدر پسند آیا تھا کہ اپنے وطن سے بیزار ہو چکا تھا۔ گھی کے پڑوسی بیوپاری نے بیزاری کی اس آگ کو اور بھی ہوا دے رکھی تھی۔ ویسے دونوں امریکہ اور فرانس سے اتنے متاثر ہوئے تھے کہ دونوں ملکوں کی خارجہ پالیسی پر یہاں آپس میں جھگڑ رہے تھے اختلافات اتنے گہرے تھے کہ بقیہ عمر میں اتفاق رائے کا کوئی امکان نظر نہ آتا تھا ان کی گفتگو دلچسپ ضرور تھی مگر مصیبت یہ تھی کہ ان میں سے ایک قدرے اونچا سنتے تھے۔ نتیجہ یہ تھا کہ دونوں بہت اونچا بولتے تھے۔

دو تین اسٹیشنوں تک میں اکیلا بیٹھا اپنی خوش قسمتی یا بد قسمتی پر غور کرتا رہا کبھی سوچتا کہ مزے میں ہوں کوئی واہیات "شاتد مقابل" مل جاتا تو جان ضیق میں ہوتی کبھی سوچتا نہیں اس درجے میں تنہائی و خاموشی راحت نہیں اذیت ہے آدمی اطمینان سے پڑھ سکتا تو ایک بات بھی تھی مگر جس بلند پیمانے پر یہ معزز

ہم سفر بات چیت کر رہے تھے اس ہنگامہ صوت وصدا میں پڑھنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ کئی مرتبہ کتاب نکالی لیکن دو سطروں کے بعد بین السطور سے گھی ابلنے لگا۔ نیویارک اور پیرس نے راستہ روک لیا۔

بارہا یہ ارادہ ہوا کہ چلو میں بھی ان کی گفتگو میں کود جاؤں مگر پھر طبیعت ادھر نہ آئی "گھی والوں" سے تو اشتراک عمل ناممکن تھا کہ یہ موضوع میری گرفت سے باہر تھا دوسرے یہ ڈر کہ اگر گھی کی مختلف ملاوٹیں سمجھ میں آگئیں تو وہ چیز بھی سمجھ میں آجائے گی جسے ہم گھی سمجھ کر کھا رہے ہیں۔ امریکہ فرانس والی بحث یقیناً میرے ڈھب کی تھی ان ملکوں کا کوئی براہ راست مشاہدہ تو دامن میں نہ تھا لیکن دوسری جنگ عظیم میں فرانسیسیوں کو بھاگتے ہوئے دیکھ چکا تھا۔ رہا امریکہ تو آج کی دنیا میں امریکہ سے کون ناواقف ہے؟ ویسے گاڑی میں سخن طرازی کے واسطے یہی کافی ہے کہ آدمی منہ میں زبان رکھتا ہو مگر مصیبت یہ تھی کہ وہ دونوں کسی تیسرے شخص کو در آنے کا موقع ہی کہاں دیتے تھے بے ربط مگر مربوط و مسلسل بول رہے تھے ایک کی سانس کے ساتھ جملہ ٹوٹتا تو دوسرا پکڑ لیتا دوسرا دم توڑتا تو پہلا تازہ دم موجود۔ شوق و انہماک کا یہ عالم کہ گرمی کا شباب تھا مگر پانی تک نہیں پی رہے تھے مبادا دوسرے کو زیادہ مہلت گفتگو مل جائے۔ ایک مرتبہ لیمنڈ کے دو گلاس منگوائے تو پانی کا یہ حشر ہوا کہ گلاس میں پڑے پڑے ان کی بحث کی طرح گرم ہو گیا ہوا یہ کہ پانی آنے پر امریکہ اور فرانس کے پانیوں پر ایک نئی بحث کا دروازہ کھل گیا۔ اب گلاس ہاتھ میں ہیں مگر گھونٹ پینے کی فرصت نہیں۔ درمیان میں میرا جی چاہا کہ ان سے گلاس چھین کر خود چڑھا جاؤں مگر ع

پھر خیال آیا کہ موسیٰ بے وطن ہو جائے گا

میں چاہتا تو زبردستی ان کی گفتگو میں کود جاتا۔ مداخلت بے جا جتنا مذموم فعل ہے اتنا ہی اس کا ارتکاب آسان ہے مشکل ضرور تھا مگر ناممکن نہ تھا کہ میں دونوں کو اکھاڑ پچھاڑ کر اپنے مشرق وسطیٰ کو ان کے فرانس اور امریکہ کے درمیان چھوڑ دیتا لیکن یہ ڈر دامن کش تھا کہ ان بھلے مانسوں سے یوں چیخ چیخ کر بات کون کرے گا؟ کہیں تھوڑی سی تسکین کی یہ آرزو خوفناک مشقت میں نہ بدل جائے۔ پھر یہ لوگ جو فرانس اور امریکہ ایسے ملکوں پر لہولہان ہو رہے ہیں اگر "مشرق وسطیٰ" کے ساتھ مجھ پر بھی پل پڑے تو مجھے کون چھڑائے گا؟

میں اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ گاڑی ایک اسٹیشن پر ٹھہر گئی اور میں اسی ٹوہ میں کہ کہیں سے کوئی ہم سفر مل سکے تو پکڑ لاؤں پلیٹ فارم پر اتر گیا۔ اس جستجو میں ہر تیز رو کے ساتھ چند قدم چلتا رہا لیکن ہمارے درجہ کی طرف کوئی نہ آیا۔ ناکام لوٹ کر اپنے درجے میں آیا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ایک نووارد میرے سامنے والی نشست پر متمکن ہیں۔ خوشی کی حد نہ تھی کہ دیکھو کس طرح اللہ میاں نے گویا چھپڑ پھاڑ کر ایک رفیق سفر بخش دیا۔ نووارد پر ایک بھرپور نظر ڈالی تو میں سر سے پیر تک کانپ گیا۔ سر گباشی ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور کی تصویر تو آپ نے دیکھی ہو گی اس کی نورانیت۔ روحانیت، ذہانت، عظمت اور نفاست وغیرہ ہر چیز خارج کر دینے کے بعد جو کچھ رہ جاتا ہے وہ نووارد کی شکل میں میرے سامنے بیٹھا تھا آنکھیں ضرور بڑی بڑی اور روشن روشن تھیں مگر ع

صرف آنکھوں کو کیا کرے کوئی؟

سر کے بال اتنے طویل کہ کوئی دوسرا آدمی اٹھا کر چلے۔ سن ساٹھ سال سے اوپر صحت نگڑی۔ الٰہی خیر اسنگ آمد و بخت آمد۔ مگر پھر دل کو تسلی دی کہ آدمی دلچسپ معلوم ہوتا ہے نہیں بھی ہے تو چلو جو مل گیا اس پر قناعت سہی۔

گاڑی حرکت میں آئی تو وہ بھی حرکت میں آ گئے۔ مجھ سے تو انہوں نے کچھ نہیں فرمایا البتہ بڑی گھن گرج کے ساتھ فارسی کا ایک شعر پڑھ کر فضا میں چھوڑ دیا۔

مردہ دل از عمر برخوردن نمی داند کہ چیست

ہر کہ دل را زندہ شد مردن نمی داند کہ چیست

شعر پڑھنے کے بعد نووارد نے ہم سب پر تولنے ٹٹولنے والی ایک نظر ڈالی مگر وہاں کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگی تھی۔ گھی والے بدستور گھی میں غرق تھے باقی دو وہی یوروپ امریکہ میں گھوم رہے تھے۔ رہ گیا میں۔ تو میں چونکا ضرور۔ دل میں یہ بھی سوچا کہ ہم سفر تو کام کا معلوم ہوتا ہے لیکن تیل اور تیل کی دھار دیکھنے کے لیے چپ رہا۔ ایسا نہ ہو کہ لینے کے الٹے دینے پڑ جائیں۔

نووارد زیادہ توقف نہ کر سکا۔ دو چار لمحوں کے بعد آپ نے ایک اور شعر پڑھ دیا۔ اب کی مرتبہ آپ بلند بانگ لیکن نہایت واہیات سی شاعرانہ لَے میں گا رہے تھے شعر تھا۔

دل زدستم برد آں شوخے کہ از طفلی ہنوز

لذت مضمون دل بردن نمے داند کہ چیست

واقعہ یہ ہے کہ اس پر ہمارا دل بھی ہاتھ سے نکل گیا۔ بے اختیار دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ ایسے صاحب دل، عاشق مزاج اور درویش منش بزرگ سے

ضرور بات کرنا چاہیئے۔ بات چھیڑنے کی ایک مجبوری یہ بھی آپڑی کہ اگر مجھے خاموش پاکر انہوں نے ترنم کے ساتھ غزلے دو غزلے چھیڑ دیئے تو رہائی کا آخری روزن بھی بند ہو جائے گا۔

"مولانا! کہاں تشریف لے جا رہے ہیں آپ؟" میں نے ہمت کر کے سلسلہ جنبانی کی۔

"ہر شے مسافر ہر چیز راہی"۔ انہوں نے جواب دیا۔

"جی۔ جی۔ وہ تو بیشک۔ ایسا ہی ہے مگر کہیں تو آپ جا رہے ہوں گے اس وقت"، میں نے پھر جسارت کی۔

گھر میرا نہ دلّی نہ بخارا نہ سمرقند"۔ یہ کہتے ہوئے انہوں نے سر اور گردن کو ایک ایسا جھٹکا دیا کہ ان کے طویل بال ولی اور بخارا اور سمرقند تک پھیل گئے میں دل میں خاصہ پشیمان ہو رہا تھا مگر سوچا دو ایک ہاتھ اور سہی۔

"یہ حوصلہ اپنی جگہ بڑا قابل تعریف ہے"۔ تاہم فی الحال کہاں کا قصد ہے۔

مگر ڈھاک کے وہی تین پات۔ بولے۔

"درویش خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی"

میں سمجھ گیا کہ یہ بزرگوار عاشق ہی نہیں واقع ہوئے مجذوب بھی معلوم ہوتے ہیں شاعر قسم کے مجذوب۔ ماتھا ٹھنکا۔ سخت مشکل کا سامنا تھا۔ جائے ماندن نہ پائے رفتن۔ خاموش رہتا ہوں تو وہ گانے لگتے ہیں۔ بات کرتا ہوں تو بات چلتی ہی نہیں مگر

اب وہ کرے علاج دوست جس کی سمجھ میں آسکے

کافی سوچ بچار کے بعد ایک علاج سمجھ میں آیا کہ نثر کے بجائے ان سے شعر میں

گفتگو کی جائے۔ مصرعے کا جواب مصرعے سے دو۔ چنانچہ میں نے بھی موقع محل، ربط، مناسبت ہر معقولیت کو بالائے طاق رکھ کر اقبال کا ایک مصرعہ ٹھوک دیا ؏

جو مشکل اب ہے یارب! پھر وہی مشکل نہ بن جائے

مگر اس مصرع نے یہ مشکل پیدا کر دی کہ مصرع سنتے ہی وہ بیچ بیچ مرغ بسمل کی طرح پھڑک اٹھے۔ ان کے تڑپنے پھڑکنے پر تو خیر ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا تھا لیکن دوسرے لمحہ اس مشکل نے یہ خوفناک صورت اختیار کر لی کہ وہ تڑپ کر اٹھے اور مصرع دہراتے ہوئے مجھے نیاز مند سے لپٹ گئے۔ یہ منظر دیکھ کر امریکہ اور فرانس والوں نے تیوری چڑھا کر اپنے وطن کو چند صلواتیں سنائیں اور گھی والوں نے ایک قہقہہ لگایا۔ وہ تو خیر ایک نظر ڈال کر فرانس اور گھی کی طرف پلٹ گئے لیکن ہماری مصیبت جاری تھی۔ لپٹنا اور عالم جذب و مستی کا لپٹنا۔ اللہ دے اور بندہ لے۔ میں نے اس روز پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ ڈوبنے والا بچانے والے کو کس طرح دبوچتا ہے۔ ان کے لپٹنے میں تھوڑا سا اضافہ یہ بھی تھا کہ لپٹ کر اچھلتے بھی تھے۔ خیر بہ ہزار وقت میں نے پہلے ان کے بالوں کو اور پھر خود ان کو اپنے سے علیحدہ کیا۔

"آپ کا تخلص؟ ——" تو وارد اب گفتگو کی موڈ میں آ گئے۔

"کچھ نہیں ——" میں نے حواس جمع کرتے ہوئے کہا۔

"کچھ نہیں سبحان اللہ —— بالکل اچھوتا تخلص ہے ورنہ نوجوان شعرا کو نیا تخلص بھی نہیں سوجھتا۔"

"یہ تخلص نہیں ہے قبلہ —— میں نے عرض کیا ہے کہ میں شاعر وغیرہ کچھ نہیں ہوں —— میں صاف مکر گیا۔ مبادا کوئی اور ہنگامہ کھڑا ہو جائے۔"

رب العلا کی قسم! برخوردار تم شاعر پیدا ہوئے ہو ورنہ اتنا برمحل مصرعہ اور حکیم

کے کلام میں سے ——— میں کہتا ہوں کہ اے سبحان اللہ!"

بعد میں معلوم ہوا کہ آپ علامہ اقبال کو ازراہ بے تکلفی محض حکیم کہہ کر پکارتے ہیں۔

"جی نہیں۔ میں قطعاً شاعر نہیں ہوں۔ میرے خاندان میں شاعر تو کجا آج تک کوئی

قلعی گر تک پیدا نہیں ہوا ——— "میں بوکھلاہٹ میں نہ جانے کیا کہہ گیا۔

"اچھا۔ تعجب خیز.... مگر بہرحال سخن فہم تو آپ ضرور ہیں"

"جی ہاں۔ کچھ شغف تو ہے ——— "میں نے اس خوف سے مبادا انکار پر

کوئی نیا شاخسانہ پیدا ہو جائے سخن فہمی کی حامی بھر لی لیکن دل میں برابر یہ کانٹا کھٹک

رہا تھا کہ اپنی سخن فہمی کے ہاتھوں خدا معلوم میرا کیا حال ہوا۔ البتہ ایک تسکین ضرور تھی

کہ اب کے یہ گھی اور امریکہ فرانس والے بھی ان کے وجد و حال کی زد سے محفوظ نہیں رہ

سکیں گے۔

میرا خیال تھا کہ اب وہ چھوٹتے ہی اپنا کلام سنائیں گے۔ مگر کلام سے پہلے انہوں نے اپنا تعارف کرانا بھی مناسب سمجھا تعارف تو بہت لمبا چوڑا تھا کہ انہوں نے اس بہانے سے اپنی ساٹھ سالہ زندگی کی پوری جنتری کھول کر میرے سامنے رکھ دی تھی۔ بہرکیف اس تعارف کا خلاصہ یہ ہے کہ آپ کا نام شاہ لعل محی الدین بادشاہ مخدوم تھا۔ صوبہ بہار کے ایک علمی خانوادے میں پیدا ہوئے تھے مگر وہاں صرف پیدا ہو گئے تھے۔ تمام عمر گھومتے پھرتے گزری تھی۔ یہ تو معلوم نہ ہو سکا کہ ذریعہ معاش کیا ہے۔ البتہ اتنا صاف ظاہر تھا کہ شعر کہنے اور سفر کرنے کے علاوہ کوئی دوسرا کام وہ قطعاً نہیں کرتے۔ شاعری ان کو ورثہ میں ملی تھی۔ تواتر کے ساتھ پشت در پشت ڈھلتا ہوا یہ

ورنہ ان تک پہنچتے پہنچتے شاعری سے زیادہ مجذوبیت کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ تخلص تقریباً ہر سال بدل لیتے تھے۔ آج کل "قادری سہراوردی" تھے۔ شاعری کے سلسلہ میں اخبار و جرائد کے ایڈیٹروں کو بے نقط سناتے تھے کہ یہ لوگ ان کے پیام کو قوم تک نہیں پہنچنے دیتے۔ نتیجہ یہ کہ اب ریل گاڑیوں، ٹراموں موٹروں تانگوں اور سڑکوں میں لوگوں کو پکڑ پکڑ کر اپنا کلام سناتے ہیں۔ شعر میں خود کو حکیم کا "نمکخوار" کہتے ہیں۔ کلام سے معلوم ہوا کہ "حکیم کے نمکخوار" ہی نہ تھے۔ اس کی پوری شاعری کو چبائے جا رہے تھے۔ تخلص کے سوا کوئی چیز اپنی نہ تھی۔ خیال، نہ اسلوب، نہ الفاظ۔ تخلص کا بھی کہیں کہیں یہ حال کہ گھٹنوں تک بحر سے خارج۔ قادری اندر ہے تو سہراوردی باہر۔ دونوں سما گئے ہیں تو مضمون کا پتہ کٹ گیا ہے۔ اس پر ترنم۔ گویا سونے پر سہاگہ۔ سننے، سنانے والا، دونوں اذیت میں۔

کلام سنانے بیٹھے تو برابر سوا سو میل تک سناتے چلے گئے تھکان اور بے دلی کے مارے میرا بُرا حال تھا مگر ان کے خوف کی وجہ سے دم بخود بیٹھا سر ہلاتا رہا۔ ڈیڑھ سو میل کے سفر کے بعد بھی جب مخلصی کی کوئی صورت نظر نہ آئی اور ادھر میری منزل مقصود قریب آنے لگی تو میں نے ہمت کر کے ٹوکنا شروع کیا۔ مثلاً ایک خارج البحر شعر پر عرض کیا:

قبلہ! یہاں ——— سہراوردی کی "وردی" اتر گئی ہے۔"

مسکرا کر بولے ——— "کوئی مضائقہ نہیں۔"

مگر اس کے بعد کم از کم اتنا ہوا کہ وہ شعر چھوڑ کر فلسفہ شعر پر اتر آئے۔ اپنے ایک شعر پر انگلی رکھ کر کہنے لگے:

"دیکھیے ــــ میں نے "جہنم" کے "طاہرِ لاہوتی پر اضافہ کیا ہے"۔

میں نے کہا ــــ "منصوبہ تو اچھا ہے، مگر قبلہ جو طائرِ لاہوتی" آپ نے پیش کیا ہے مجھے تو یہ کوے کی نسل کا کوئی پرندہ معلوم ہوتا ہے"۔ اس پر ہنس کر بولے ــــ "طائرِ لاہوتی" کے بارے میں مشکل یہ ہے کہ

"دیتا ہے دھوکہ یہ بازی گر کھلا"

"طائرِ لاہوتی" کو وہیں چھوڑ کر اب انہوں نے اپنے تھیلے سے ایک رنگین مصور کاغذ نکالا۔ بولے:

"ملاحظہ ہو ــــ میرے دیوان کا سرورق۔ یہ تصویر میں نے خود بنائی ہے۔ خیال بھی خاکسار کا اپنا ہے"۔

"مگر دیوان کہاں ہے؟" میں نے پوچھا:

"وہ ابھی مرتب نہیں ہو سکا"۔

سرورق دیکھا تو اس میں کچھ پہاڑ اور درخت تھے جن کی پھننگوں اور چوٹیوں پر کچھ پرندے پر پھیلائے بیٹھے تھے۔ دامن کوہ میں ندی بہہ رہی تھی جس کے کنارے جھونپڑے میں ایک جٹا دھاری سادھو بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ جھونپڑے سے قدرے ہٹ کر سبز رنگ کا ایک کنکوا آسمان کی طرف اڑا جا رہا تھا۔ میں نے سرورق دیکھ کر ان کی طرف دیکھا تو بولے:

"غالباً آپ خیال تک نہیں پہنچ سکے"۔

"کچھ کچھ سمجھ تو گیا ہوں" میں نے جواب دیا۔ "مثلاً یہ پرندے تو آپ نے "جہنم" والے عقاب، شاہین اور چرے بٹھا رکھے ہیں مگر یہ سمجھ میں نہ آیا کہ یہ سادھو یہاں بیٹھا

کیا کر رہا ہے۔"

"نہیں سمجھے نا" وہ چمک کر بولے "سادھو نہیں، حضرت یہ وہ درویش خدا مست ہے، جو شرقی ہے نہ غربی۔"

"اور یہ کنکوا کہاں اڑا جا رہا ہے؟"

"یہ پتنگ نہیں، خودی بلند ہو رہی ہے، خودی۔"

"خوب! بہت خوب! بڑا مبارک، نہایت نیا خیال ہے" میں بے خیالی و بیزاری میں نہ جانے کیا کہہ رہا تھا کہ حواس میں آ کر دیکھا تو حضرت شاہ لعل محی الدین بادشاہ بیاض کا دوسرا جزو کھول رہے تھے۔ میں بھی مزید کلام سننے کو سنبھل کر بیٹھ گیا۔ مگر دل میں سخت پشیمان اکہ الٰہی! کس جرم میں پکڑا گیا ہوں۔ یہ اندیشہ الگ لاحق کہ اب جو یہ تازہ دم ہو کر بیٹھے ہیں تو ہو سکتا ہے مجھے اپنے اسٹیشن پر اترنے ہی نہ دیں۔ ادھر اسٹیشن آ جائے اور عین اسی وقت یہ ادھر مجھ سے لپٹے ہوئے ہوں میں انہیں وسوسوں میں تھا کہ تائید غیبی میری امداد کو آ پہنچی۔ ہوا یہ کہ امریکہ اور فرانس والوں میں سے کسی نے نہ معلوم کیوں یہ سلسلہ سیاحت روم اقبال کا یہ مصرع پڑھ دیا ؏

سوادِ رومۃ الکبریٰ میں دلّی یاد آتی ہے

میری خوش قسمتی تھی کہ یہ آواز حضرت شاہ صاحب کے کان میں جا پڑی۔ آپ مدت کے بھرے بیٹھے تھے۔ چنگھاڑ کر اٹھے اور ان صاحب پر جا پڑے۔ مزید خوش قسمتی یہ ہوئی کہ ٹھیک اسی وقت میرا اسٹیشن آ گیا۔ اور میں دونوں ہاتھوں میں اپنا سامان سمیٹ کر نیچے اتر گیا۔

گاڑی چلی تو میں ابھی پلیٹ فارم پر کھڑا تھا۔ اپنا درجہ سامنے سے گزرا تو دیکھا کہ حضرت شاہ لعل محی الدین بادشاہ مخدوم قادری سہر اوردی نے فرانس والے کو دبوچ رکھا تھا۔

لالہ مصری خان کا خضاب لگانا

للہ مصری خان نے فوج میں خدمت تو نہیں کی تھی مگر چالیس برس تک فوج کی رفاقت کی تھی۔ یہ ہندوستان پر انگریز کے عہد حکومت کی بات ہے۔ آپ رسالے کی ایک گورا رجمنٹ کے افسروں کو اردو پڑھاتے پڑھاتے، انگلستان اور ہانگ کانگ تک ہو آئے تھے۔ اگرچہ ان کی اپنی اردو سے اندازہ ہوتا تھا کہ آپ نے انگریزوں کو اُردو پڑھائی نہیں بلکہ انگریزوں سے اُردو پڑھی تھی۔ مدت تک ایک ایک انگریز افسر پرسی ملکرگن کے ساتھ ایک خیمے میں رہے۔ پہلی عالمی جنگ کے بعد جب پرسی ملکرگن لیفٹیننٹ جنرل کی حیثیت سے آخری مرتبہ قید ہوتے تو للہ مصری خان گھر آگئے۔ دوسری جنگ عالمگیر انہوں نے اخبارات ہی میں پڑھی اور لڑی۔ ہم نے جب بچپن میں قدم رکھا، للہ مصری خان بڑھاپے کے "ایڈوانس" مرحلے میں جارہے تھے۔ ۱۹۳۹ء میں، جب دوسری عالمی جنگ چھڑی تو للہ کا سب سے چھوٹا بیٹا، کالا، جو چوتھے نمبر پر فالن ہوا تھا۔ ۳۹ برس کا ہوچکا تھا۔ "منشی گیری" کے زمانے میں انہوں نے اتنا پیسہ کمالیا تھا کہ ۱۹۱۸ء میں جب وہ گاؤں میں واپس آئے تو علاقے کے ممتاز و معروف سفید پوشوں کی سی زندگی گزار سکتے تھے۔ مثلاً جیسے کوئی ذیلدار ہو۔ یا جیسے کوئی ڈسٹرکٹ بورڈ کا ممبر یا پنشنر صوبیدار میجر۔ عادات میں ان کے اندر دیسی انگریزی کی کھچڑی پک چکی تھی۔

ہم نے ان کو اسی برس کی عمر میں دیکھا (اسی برس کے وہ تھے) وہ فطرتاً

حلیم الطبع آدمی تھے مگر بعض باتوں پر فوراً بھڑک اٹھتے ان میں سے ایک بات۔ بڑھاپے کا ذکر تھا۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ وہ ان کو بوڑھا کہہ سکے۔ کسی احمق سے یہ گستاخی سرزد ہو جاتی تو پہلے ان کی مونچھیں کھڑی ہو جاتیں پھر خود کھڑے ہو جاتے چہرہ غصے سے لال بھبھوکا ہو جاتا۔ منہ سے جھاگ چھوٹنے لگتی۔ مارنے مرنے پر اتر آتے ہر چند انہوں نے فوج کی تربیت نہیں پائی تھی۔ مگر وہ سپاہیوں کی خو بو رکھنے کے دعویدار تھے۔ اکثر کہا کرتے تھے ___ سپاہی کبھی بوڑھا نہیں ہوتا۔ ع

طاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی

ذہن کو چوکس رکھنے کے لئے انہوں نے قصبے سے روزانہ اخبار لگوا رکھا تھا ___ اس میں سب سے پہلے افسروں کی تقرریوں اور تبادلوں کی خبریں پڑھتے۔ جسمانی صحت کا بھی بہت خیال رکھتے۔ سات آٹھ میل کی روزانہ سیر ان کا معمول تھا۔ چائے کی پیالی کے بعد لسی کا پیالہ بھی پی لیتے تاکہ "جرمن" (چائے) اور "روس" (لسی) آپس میں لڑ بھڑ کر اندر ہی اندر کمزور ہوتے رہیں۔ ___ مصنوعی دانتوں کی دو جوڑیاں تھیں۔ ایک جبڑوں میں، دوسری کٹوری میں دھری رہتی۔ جس طرح رنجیت سنگھ کے بارے میں مشہور ہے کہ گھوڑا اس کے پلنگ کے سامنے کھڑا رہتا تھا۔ مونچھوں کی بڑی دیکھ بھال کرتے۔ جوانی کی گنجان، گھنی، بارعب مونچھیں آخر دم تک اسی آن بان سے لہراتی رہیں داڑھی روزانہ مونڈتے۔ مونچھوں کو خضاب جمعرات کی جمعرات لگاتے۔ وضع داری کا یہ عالم کہ جب تک داڑھی مونڈ نہ لیتے، قدم گھر سے باہر نہ دھرتے، جیسے ڈیوڑھی سے نکلتے ہی سامنے کمانڈنگ افسر کھڑا ہو گا۔ جب ایک اصول طے ہو چکے تو اس سے انحراف کیسا! خضاب کا دن۔ گھر والوں پر بہت بھاری ہوتا خضاب کے لیپ کے اوپر پیپل

ببول کے پتے بھجائے جاتے تھے اور ببول کا درخت اس علاقے میں اگتا نہ تھا چنانچہ ہفتے کے ہفتے ڈیڑھ دو ٹوکرے "پتے" دوسرے ضلعے سے "امپورٹ" کرنا پڑتے۔ ایک مرتبہ ایک "بجروٹے" نے پتوں پر حملہ کیا تو اس میں آپ مجروح ہو گئے کیونکہ آپ اس وقت پتوں میں بندھے ہوتے تھے اس روز سے گھر میں بکری کا داخلہ ممنوع قرار پایا۔

فرماتے۔ بکری اور خضاب اکٹھے نہیں رہ سکتے جس روز خضاب لگاتے، چھ سات گھنٹے تک منہ پر پٹی بندھی رہتی۔ جس سے بول، چال میں تکلیف ہوتی۔ بول چال کیلئے نذرے میراثی کو اپنے پاس بٹھائے رکھتے۔

داڑھی مونڈنے کا عمل بھی ان کے لئے کچھ کم کٹھن نہ تھا۔ بلپٹن میں ایک مدت تک حجام سے داڑھی منڈواتے رہے لیکن ایک مرتبہ ہانگ کانگ میں یا شاید عدن میں کچھ عرصہ کسی کرنل براؤن کے ساتھ ایک خیمے میں رہنا پڑا تو داڑھی خود بنانے کی عادت پڑ گئی۔ جو رفتہ رفتہ ایک نشے کی کیفیت اختیار کر گئی۔ سر کے بال ان کی گرفت سے باہر تھے۔ ورنہ وہ ان سے بھی خود ہی نبٹ لیتے۔ جزرسی کی عادت بھی اسی کرنل براؤن سے سیکھی۔ سیفٹی مشین لارڈ کچنر کے زمانے میں خریدی تھی۔ ایک ایک بلیڈ کئی سال چلتا بلکہ چلایا جاتا۔ بلیڈ کو روزانہ آدھ گھنٹہ کسوٹی پر رگڑ کر تیز کرتے۔ عملاً اس عمل میں کسوٹی تیز ہوتی۔ بہرحال ان کا داڑھی مونڈنا، اچھی خاصی جراحی کا عمل تھا۔ وہ بال مونڈتے نہ تھے، بہ نفس نفیس ایک ایک بال کے پاس جا کر، بال کو کھال سے اکھاڑتے تھے۔ نوبت ٹھوڑی کے بالوں تک پہنچتی تو گویا فریقین میں دست بدست لڑائی شروع ہو جاتی۔ اس کارروائی میں آپ اکثر لہولہان بھی ہوئے۔ مگر میدان یعنی ٹھوڑی ہمیشہ انہی

کے ہاتھ رہی۔

لالہ مصری خان کا دفتر لگانا

زندگی اور سلیقے کا آپس میں چولی دامن کا رشتہ ہے۔ یہ تو میں نہیں کہہ سکتا کہ دونوں میں سے چولی کون ہے اور دامن کون ہے۔ ہاں یہ کہہ سکتا ہوں کہ سلیقے کے بغیر انسان اور زندگی کا وہی حشر ہوتا ہے جو ـــ چولی کے بغیر دامن کا یا دامن کے بغیر چولی کا ـــ سچ پوچھیے تو انسانی زندگی اور سلیقے کا باہمی رشتہ ـــ چولی اور دامن کے رشتے سے کچھ زیادہ گھنا معلوم ہوتا ہے۔ چولی کے بغیر دامن ـــ اور دامن کے بغیر چولی ـــ ممکن ہے کچھ نہ کچھ مصرف رکھتی ہو۔ لیکن سلیقے کے بغیر زندگی اول تو یکسر مہمل ورنہ نہایت پیچیدہ ضرور ہو جاتی ہے۔ جبھی تو کسی شاعر نے کہا ہے۔ ع

خود اپنے لئے راہ زن ہوش رہے ہم

سلیقہ دراصل زندگی کا دوسرا نام ہے۔ ہم اس نکتے کو اپنے جگری دوست لالہ مصری خان بحر کی مثال سے واضح کریں گے۔ اب تو خیر لالہ کو ملازمت سے ریٹائر ہوئے ایک مدت گزر چکی لیکن وہ "حاضر نوکری" میں بھی عملاً ریٹائر ہی معلوم ہوتے یہ بات نہ تھی کہ وہ کام نہ کرتے ہوں۔ کام تو وہ اتنا کرتے تھے کہ گھر کے کام ویران پڑے رہتے۔ بیگم کبھی گھر کے معاملات سے بے توجہی کا گلہ کرتیں تو لالہ اپنے دو چھوٹے بچوں کو اپنے ہمراہ دفتر لے جاتے برخورداروں کے چٹورپن کی انتہا نہ تھی۔ منہ ہر وقت چلتا رہتا۔ لالہ دن بھر اپنے ماتحتوں سے کاغذات اور بچے "قلاقند" مانگتے رہتے چھوٹے

صاحبزادے کو، جو آج کل ایک بڑے کارخانے کے بڑے صاحب ہیں، مرغ کی تصویریں بنانے کا شوق تھا۔ دفتر میں جو آدمی لالہ کو ملنے آتا، برخوردار جھٹ دفتر کی موٹی سرخ پنسل اٹھا کر ملاقاتی کے ماتھے یا ہتھیلی پر مرغ کی تصویر بنا کر بلند آواز میں "بانگ" دینے لگ جاتا۔

اُردو شاعری کے چند مصرعے اپنے یوم ولادت ہی سے اتنے مشہور اور اس کثرت سے مستعمل چلے آتے ہیں کہ ان کو مزید استعمال کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔ مگر کیا کیجئے کہ ان میں سے ایک مصرعہ ہم اس وقت استعمال کرنے پر مجبور ہیں وہ ہے؛

ہر چند کہ ہے مگر نہیں ہے

کچھ یہی کیفیت دفتر میں لالہ کے کام کرنے کی تھی کام ہوتا بھی تھا اور نہیں بھی ہوتا تھا جیسے فوجی کارروائیوں میں "پٹرولنگ" ہوتی رہے مگر دھاوے کی نوبت نہ آئے۔

لالہ ایک اہم محکمے میں ایک ایسی کلیدی پوزیشن پر فائز تھے کہ اگر ان کے دفتر سے کاغذ نہ نکلے تو شہر کے نلکوں سے پانی نہیں نکلتا تھا۔ ان دنوں ملازموں کے "گریڈ" دور سے آواز نہیں دیا کرتے تھے۔ لالہ کا "گریڈ" تو کسی کسی کو معلوم ہوگا۔ البتہ یہ سب لوگ دیکھ سکتے تھے کہ وہ محکمے پر اور محکمہ ان پر چھایا ہوا تھا دفتر ان کے کھولے کھلتا اور ان کے باندھے بندھتا۔ نتیجہ یہ تھا کہ محاورے میں کھلا اور روزمرہ میں بند رہتا یہ اسی طرح کا کھلنا اور بند ہونا تھا جس کی طرف غالب نے یوں اشارہ کیا ہے ع

کام گر رُک گیا روانہ ہوا

ہم کبھی کبھی لالہ کے دفتر میں بھی جا بیٹھتے ان کے میز پر کاغذات کے مینار ایستادہ دیکھ کر جی گھبرانے لگتا۔ وہ خود اپنے دفتر کو کاغذات کا جنگل کہا کرتے۔ اس صورت حال

سے نازاں بھی تھے۔ مگر یہ جنگل اگایا ہوا بھی ان کا اپنا تھا۔ کاغذ آتے رہتے انبار لگتے، مینار بنتے، اور لالہ ان میں دبتے چلے جاتے۔ "الف"۔ "ب" میں گڈ مڈ — "ت"۔ "ٹ" سے نتھی — "ج"۔ "د" سے گتھم گتھا — لالہ عموماً گردن گردن کاغذوں میں چھپے رہتے۔ بعض اوقات ان کی صرف ٹوپی ہی دکھائی دیتی۔ اکثر دیکھا کہ جس کاغذ کی جستجو ہوتی وہ ان کو کبھی نہ ملا ہاں جس کاغذ کی ضرورت نہ ہوتی وہ اس کثرت سے ملتا کہ دوسرے کاغذات کو نہ ملنے دیتا۔

لالہ کی عینک کاغذات کے ڈھیر میں اکثر غائب ہو جاتی۔ دفتر کے ایک بابو کی صرف یہی ڈیوٹی تھی کہ وہ کاغذات کے جنگل میں سے ان کی عینک ڈھونڈھتا رہے۔ ایک مرتبہ ان کی عینک کسی مثل میں بندھ کر کمشنر صاحب (آپ کا جی چاہے تو بریگیڈیئر پڑھ لیں) تک چلی گئی۔ واپس آئی تو لالہ چپڑاسی پر غصہ جھاڑنے لگے۔

"اوئے مہربان خان۔ یار تم تو بالکل اندھے ہو۔ کاغذات میں ہماری عینک باندھ دی۔ لگتا ہے کسی روز خود ہمیں کسی مثل میں باندھ کر FOR APPROVAL اوپر بھیج دو گے۔ ذیابیطس کا مریض ہوں۔ میاں! — کل چھتیس ٣٦ سیر رہ گیا ہوں۔"

جس دفتر میں "حاضر کاغذات"، "غیر حاضر رہتے ہوں وہاں سابقہ "حوالہ جات" تو گویا "حوالات" ہی میں بند ہوں گے۔ چنانچہ کام — قدم قدم پر رک جاتا۔ لالہ مصری خاں کچھ پیالہ و پتھر نہ تھے، آخر انسان تھے، دفتری ابتری پر جھلا اٹھتے — جھلاتے تو مصری میں کریلے کی کڑواہٹ در آتی - اہل کاروں۔ حاجت مندوں سے الجھنے لگتے

دفتر کی کارکردگی پر ناگوار اثر پڑتا۔ شہر کے نلکے بند ہو جاتے۔ ملاقاتیوں کے تانتے سے بھی وہ سخت عاجز تھے۔ کہتے تم میں سے اکثر اصحاب محض گپ شپ لڑانے اور چائے پینے آتے ہیں۔ وہ دفتر کو "کافی ہاؤس" کہتے۔ بیٹھے ہم سا کوئی بے تکلف بے فکرا جا نکلتا تو اس سے گم شدہ کاغذات ڈھونڈوانے لگتے۔ ایک مرتبہ ہم "ہرمز" نامی سڑک کوٹنے والا ایک مرمت طلب انجن کی مثل ڈھونڈ رہے تھے کہ کاغذات میں سے "ہرمز" کی دو ڈھیریاں مل گئیں۔

لالہ کے گھر کا نقشہ بھی ہمارے سامنے ہے۔ ہم یہ فیصلہ نہیں کر سکے کہ ان کا گھر ان کے دفتر سے متاثر ہوا یا دفتر پر گھر کا سایہ غالب تھا۔ گھر میں ان کی روزمرہ کی زندگی ایک میز پر سمٹی ہوئی ہے، ٹوپی، کتابیں، قلم دوات، موزے، تولیہ، صابن عینک، حجامت کا سامان سبھی کچھ اسی پر ڈھیر، لکھنا اسی پر، کھانا اسی پر، دودھ کا گلاس بھی اسی پر۔ جب تک بیگم زندہ تھی وہ اس میز کو سوکن سمجھتی رہی۔ دوسرے تیسرے اس کا ملبہ صاف کر دیتیں۔ مگر اب نہ وہ قدح باقی تھا نہ وہ ساقی۔

ایک روز لالہ مجھے کہنے لگے ــــ کیقباد میاں، سوچتا ہوں، دفتر میں ایک پلنگ کیوں نہ ڈلوا لوں تاکہ ــــ لطف بھی ہوتا رہے ہوتی رہے بیدار بھی ــــ یعنی کام کے ساتھ ساتھ آرام ــــ لیٹے لیٹے ہدایات جاری ہوتی رہیں۔ ہم نے بڑی مشکل سے ان کو اس اقدام سے باز رکھا۔ عرض کیا۔ دفتر کو دفتر ہی رہنے دیجئے۔ رئیس خانہ یا "مسافر خانہ" نہ بنا دیجئے ــــ لالہ مصری خان دراصل "مخدومان دفتر" کے اس گروہ خاص سے تعلق رکھتے ہیں جن کی دفتر سے الگ کوئی زندگی نہیں ہوتی یہ لوگ کام کرنے کے لئے نہیں، مصروف رہنے کے لئے پیدا ہوتے ہیں۔ اللہ بخشے، ان کی بیگم کہا کرتی تھیں

مصری خان! تم تو دفتری دھوبی ہو۔ کاغذوں کا گٹھڑ صبح اٹھا کر گھاٹ پر لے جاتے ہو اور شام کو گھر لے آتے ہو۔

دفتر میں لالہ کی ملازمت کا آخری دن بھی ہمیں یاد ہے۔ آخری لمحے "ہرمز (انجن) کی مثل ڈھونڈھ رہے تھے۔ حسب معمول جب وہ نہ ملی تو اپنے جانشین شیخ برکت اللہ کو تاکید کر آئے کہ "ہرمز" کا ٹنٹا سب سے پہلے نمٹایا جائے۔ اتفاق دیکھئے کہ کئی برس بعد اگلے روز شیخ برکت اللہ مہندی بازار میں بانس خریدتے ہوئے ہمیں مل گئے۔ ہم نے پوچھا:

"شیخ جی — انجن والی مثل کا کیا ہوا؟"

بولے — نہیں ملی تھی — اب تو ہم خود ریٹائر ہو کر گھر آ بیٹھے ہیں۔

ہم نے دوسرا سوال کیا۔

"انجن کے مسئلے کا کیا بنا؟"

"انجن اپنی جگہ کھڑا ہے اور مسئلہ اپنی جگہ کھڑا ہے۔"

شیخ صاحب قبلہ

ان کا نام تو عبدالباسط تھا مگر چھوٹے بڑے سبھی ان کو "شیخ صاحب قبلہ" کہتے تھے۔ ان کے محکمے کا افسرِ اعلیٰ بھی انہیں "قبلہ" ہی کہتا تھا۔ دفتری امور میں ڈانٹ ڈپٹ تک "قبلہ" میں ہو جاتی ـــــ شہر میں ان کی شہرت کا یہ عالم تھا کہ اگر صرف شیخ صاحب قبلہ لکھ کر لفافہ ڈاک میں ڈال دیا جائے تو ان تک پہنچ جاتا تھا۔ اور "قبلہ" گویا ان کا "تار" کا ایڈریس تھا۔

جن دنوں کی بات میں کر رہا ہوں، قبلہ پنشن کی دہلیز پر قدم رکھ چکے تھے۔ متوسط قد۔ گہرا گیہواں رنگ، چھوٹی چھوٹی غلافی آنکھیں، سرخ بھری بھری گنجان ڈاڑھی جس کو وہ عموماً جالی دار فیتے سے باندھ کر رکھتے تھے کیونکہ اگر کھولتے تھے تو وہ نیچے سے اوپر کو جاتی تھی۔ مونچھیں اگر ڈاڑھی کے تناسب ہی سے رکھ چھوڑی تھیں مگر ڈاڑھی بندھی تھی اور مونچھیں کھلی اس لئے ڈاڑھی سے بڑی معلوم ہوتی تھیں۔ سر پر ہلکی ململ کی بھاری پگڑی۔ برجس کی طرح کا تنگ پاجامہ۔ خاکی ٹاٹ سے کی قمیض جس پر سخت ولایتی کالر اور

اس کے اوپر کھلے گریبان کا ڈراک کوٹ۔ نکٹائی باندھتے تھے اور کالر میں سنہرا بکسوا ضرور لگاتے ــــــ دراصل اس حلیئے نے ان کو "قبلہ" بنا دیا تھا ورنہ اندر سے وہ قبلہ وبلہ کچھ بھی نہ تھے۔

اندر کی بات چلی ہے تو اصل میں قبلہ کے اندر بیک وقت کئی مختلف شخصیتوں بلکہ تہذیبوں کا تصادم برپا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ بہت سے لوگ آپس میں لڑ رہے ہیں یہی وجہ تھی کہ ان کی بہت سی خوبیاں بھی بکثرت استعمال اور بے جا استعمال سے خرابیاں بن گئی تھیں ــ لوگ بظاہر ان کا بہت احترام کرتے تھے مگر غور کرتے تھے "احترام" بھی ایک طرح کا لطیفہ معلوم ہوتا ــ یہی ــ احترام، ان کے عروج وزوال کی داستان ہے۔ لیکن اس بات کو سمجھنے کے لئے پہلے ان کی زندگی کو سمجھنا ضروری ہے!

شیخ صاحب قبلہ کے قدیم بزرگ کسی زمانے میں کسی چھوٹی موٹی ریاست کے راجواڑے تھے۔ زمانے نے اپنا ورق الٹا تو راجواڑے سے دیوان ہوگئے پھر معمول ہیشہ اہل کاری پر اتر آئے اور گذشتہ کئی پشتوں سے خوانچہ فروشی کا دھندا کر رہے تھے۔ یہ تو سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ "راؤ صاحب" سے "شیخ صاحب" کب اور کیونکر ہو گئے تاہم بعض علامتوں سے ان کا "راجواڑہ" ہونا بعید از قیاس نہ تھا۔ ایک ظاہرا علامت تو بذات خود شیخ صاحب قبلہ کی مونچھ تھی جس کو وہ جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتے اور اور جس کے رنگ وروغن اور تراش خراش پر وہ اتنا خرچ کرتے کہ بقول شخصے اتنے خرچ سے آدمی دودھ دینے والی کوئی چھوٹی سی گائے پال سکتا تھا ــــــ دوسری ذہنی لعبلی اندر کی علامت ان کی "خوانچہ فروشی" تھی۔ راجواڑوں پر جب گردش آتی ہے تو وہ "خوانچہ فروشی" میں بھی ناکام رہتے ہیں۔ یہی کیفیت ان کے بزرگوں کی تھی

پیٹ مجبور کرتا تو خوانچہ لگا کر بیٹھ جاتے، راجواڑی خون موج مارتا تو خوانچہ گاہک کے منہ پر دے مارتے!

شیخ صاحب قبلہ بچپن ہی میں عام بچوں سے زیادہ ذہین اور ہونہار تھے۔ چنانچہ مسجد میں دینیات کا درس ختم کرنے کے بعد جب "خوانچہ" ان کے سامنے رکھ دیا گیا تو آپ نے یہ اپج پیدا کی کہ ایک جگہ بیٹھ رہنے کے بجائے شہر بہ شہر گھوم کر سرمہ بیچنے لگے۔ آواز میں رس تھا، کاروبار چمک اٹھا۔ اسی اثنا میں پارسیوں کی ایک تھیٹر کمپنی سے زیادہ بہتر پیش کش مل گئی اور آپ ایک مدت تک اس تھیٹر کے ساتھ اس کماری سے لے کر پشاور تک گھومتے پھرے۔ لیکن اس دور اندیشی سے کہ تعلیم کا سلسلہ بھی ساتھ ساتھ جاری رکھا۔ آدمی ذہین تھے۔ چند ہی سالوں میں پے بہ پے مڈل۔ ادیب فاضل۔ میٹرک اور منشی، فاضل وغیرہ کے امتحان پاس کر کے بہتر زندگی کی امنگ میں جب صدر دفتر میں کلرک بھرتی ہوئے تو آپ اچھی خاصی تقریر کر لیتے تھے، برے بھلے شعر کہہ لیتے تھے اور گانے میں تو واقعی سماں باندھ دیتے۔ یہ تو خیر انہیں اب تک پتہ نہ چل سکا تھا کہ وہ راجواڑہ ہیں۔ خوانچہ فروش ہیں۔ ایکٹر ہیں کیا ہیں؟ البتہ دفتر میں آتے ہی انہوں نے اس وضع قطع کی بیل بیل ڈال دی جس کا خاکہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی آرٹسٹ ——— عالم بن رہا ہو!

ملازمت کے ابتدائی دور میں شیخ صاحب قبلہ کی رفتار ترقی پر خود "ترقی" بھی انگشت بدنداں رہ گئی۔ آپ اگلی صفوں کو چیرتے پھاڑتے، دیکھتے دیکھتے سپرنٹنڈنٹی کے عہدے تک جا پہنچے۔ اس کے بعد بھی جب تک انگریز کی عملداری رہی اگر تنخواہ نہ بڑھتی تو اعزاز بڑھ جاتا۔ سال میں ایک آدھ خلعت یا انعام ضرور مل جاتا۔ احترام میں اضافہ

کر دیا جاتا۔ حد یہ تھی کہ سپرڈنٹی کے گزٹ سے پہلے خان صاحبی گزٹ ہو چکی تھی بعض نواز راہ مذاق کہا کرتے کہ انگریز جاتے وقت شاید حکومت ہی شیخ صاحب قبلہ کو سونپ جائیں۔

ان کی ترقی کا راز یہ نہ تھا کہ شیخ صاحب قبلہ تقریر اچھی کر لیتے تھے۔ کمال کا خاص پہلو یہ تھا کہ شعر تو شعر آپ "نثر" بھی گا کر ادا کرتے اور ان کی آواز میں بلا شبہ بہت کشش تھی۔ یہ تو معلوم نہیں کہ حاکموں کے نوٹس میں شیخ صاحب قبلہ کا یہ کمال کب اور کیونکر آیا مگر جب ایک مرتبہ آ گیا تو پھر ایسے افراد کے سلسلے میں مغالطے کی بنا پر انگریز کو "دوراندیشی" کے جو دورے پڑتے تھے قبلہ کو اس کا پورا پورا فائدہ پہنچ رہا تھا۔ قبلہ ملازم تو دفتر میں تھے تنخواہ سپرڈنٹی کی پاتے تھے مگر عملاً جب دیکھو باہر فیلڈ میں "سرکار انگلشیہ کی برکات کے جلسوں میں تقریریں کرتے تھے۔ چنانچہ آپ جب جھوم کر یہ شعر پڑھتے کہ:

مہینوں کے کٹتے ہیں رستے دنوں میں
گھروں سے سوا چین ہے منزلوں میں

تو جلسے کا انگریز صدر سفید سفید مونچھوں والا چیف سیکرٹری یا کمشنر اپنے دل میں دیانت داری سے سمجھنے لگتا کہ واقعی اگر ہم چلے گئے تو اس ملک میں ریلیں کیونکر چلیں گی؟ "تار" اگر ایک طرف سے چل بھی پڑا تو دوسری طرف نکلے گا کیسے؟ بہر حال ریلیں چلیں یا ٹھہریں شیخ صاحب قبلہ پوری رفتار سے چلے جا رہے تھے رفتہ رفتہ ڈپٹی کمشنر اپنے ضلعی جلسوں میں بھی ان کو بلانے لگے اور دوسری جنگ عالمگیر میں جب لڑائی کا آہنگ تیز ہوا تو قبلہ کی مصروفیت کا یہ عالم تھا کہ وہ اگر انگریز ہوتے تو ان کے لئے شاید ہوائی جہاز کا انتظام کرنا پڑتا۔ شیخ صاحب قبلہ کا ستارۂ اقبال اس وقت پورے

عروج پر تھا:

لیکن جب قوم کا ستارہ چمکا تو قبلہ کا ستارہ ڈوب گیا۔ آزادی نے پوری قوم پر ترقی کے دروازے کھولے تو ان پر بند ہو گئے۔ وجہ ظاہر تھی ——— اب نہ مغالطے کا امکان تھا نہ جلسے کا سامان۔ مغالطے آزادی نے اور جلسے لیڈروں نے صاف کر دیئے تھے۔ پھر قبلہ کی شخصیت جو ایک خاص نہج پر تعمیر پا چکی تھی اور بالخصوص ان کا احترام اپنی جگہ الگ ایک دیوار بن گیا۔ حالت یہ تھی کہ محکمے کا کوئی شعبہ ان کو اپنے ہاں لینے پر رضا مند نہ ہوتا۔ افسروں کو ڈر تھا کہ قبلہ کو کام دام کی تو عادت نہیں الٹے ہمیں ان کے احترام میں مبتلا ہو جائیں گے۔ ملازموں کے بے شمار ریلے پیچھے سے آگے نکل چکے تھے بعض بڑے بڑے سینئر افسران کے آگے بچوں کی طرح جونیئر تھے بہت سوں نے ہوش کی آنکھیں ان جلسوں میں کھولی تھیں جہاں قبلہ چیف سیکرٹری کے دائیں یا بائیں پہلو میں تشریف رکھتے تھے کیفیت اب یہ تھی کہ قبلہ جس دفتر میں ہوتے یوں معلوم ہوتا جیسے اپنے پوتوں یا نواسوں میں بیٹھے ہیں۔ سرکاری تقریبوں میں یا تو کہاں وہ بارات کے دولہا ہوتے یا اب جہاں سے قبلہ کی قطار شروع ہوتی وہاں تقریب کا شامیانہ ہی ختم ہو جاتا۔

قبلہ گذشتہ پندرہ بیس برس سے سپر ڈنٹی پر بیٹھے تھے۔ یوں لگتا جیسے قبلہ سپر ڈنٹی پر یا سپر ڈنٹی ان پر گویا جم گئی ہے۔ دلچسپ بلکہ دردناک بات یہ تھی کہ قبلہ کی شخصیت پرانے دور میں جتنی اہم ہو چکی تھی سپر ڈنٹی کا عہدہ نئے دور میں اپنی اہمیت اتنی ہی کھو چکا تھا اگر کوئی کہتا کہ اتنے بڑے بڑے لوگ آپ کے سرپرست ہیں آپ کسی سے کچھ کہتے سنتے کیوں نہیں؟ تو استغنا کے عالم میں اکڑوں ہو کر بیٹھ جاتے۔ دونوں شانوں کو اٹھا کر کانوں تک لے جاتے ڈاڑھی کا فیتہ کھول دیتے اور گویا ایک قسم کے "طائرہ ہوتی" بن کر فرماتے

برخوردار اپنے بارے میں کسی سے کیا کہوں ــــ کون ہے جو مجھے نہیں جانتا ــــ بات ٹھیک بھی تھی۔ سب لوگ ان کو جانتے تھے بلکہ خرابی ہی یہ تھی کہ سب لوگ ان کو بہت زیادہ جانتے تھے بعض سرپرست یوں مذبذب تھے کہ قبلہ کی جائز امداد بھی ناجائز سمجھے جائے گی۔ بعض یہ سوچتے کہ قبلہ کی مدد کرنے والے ہزاروں دوسرے موجود ہیں۔ اکثر لوگ قبلہ کو میرے سے دفتر کی چیز ہی نہ سمجھتے۔ دلچسپ ترین بات یہ تھی کہ قبلہ کے اکثر سرپرست جو "رموز سرپرستی" سے واقف تھے۔ ریٹائر ہو کر قبلہ کی طرح اب خود "پبلک" ہو چکے تھے۔ جو نئے سرپرست تھے ان کو یہی خبر نہ تھی کہ روشِ بندہ پروری کیا ہے؟

عام زندگی میں بھی ان کے احترام کا پایہ گر چکا تھا۔ یوں بڑے لوگ تقریبوں دعوتوں میں ان کو مدعو کرتے تھے مگر محض گانے کے لئے۔ سوال یہ تھا کہ کھانے کے بعد مہمان کیا کریں؟ شراب بند، قوال مہنگے، جادو کے پروفیسر کمیاب اور قبلہ گھر کا مال۔ شروع میں تو قبلہ اس خیال سے قدرے مطمئن رہے کہ چلو تھوڑا بہت احترام تو ہے میں بڑے سے بڑے افسر سے فون پر بات کر لیتا ہوں۔ جس سے جس وقت ملنا چاہوں چق اٹھا کر اندر چلا جاتا ہوں۔ لوگ میری چھوٹی موٹی سفارشیں بھی مان لیتے ہیں۔ موٹر میں پاس سے گزرتے ہیں تو مسکرا کر ہاتھ ہلاتے ہیں۔ ورنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے لیکن عمر اور احترام کے مختلف مرحلوں سے گزرنے کے بعد اب وہ اس صورت حال پر کچھ خوش نہ تھے۔ خوش ہوتے بھی تو کیسے۔ لوگوں نے ان کو پیشہ ور گانے والا سمجھ لیا تھا حالانکہ اگر وہ گانے کو پیشہ بنا لیتے تو پیسے بھی زیادہ ملتے اور سوسائٹی شاید احترام بھی زیادہ کرتی سرکاری دفتر کا سپرنٹنڈنٹ گا رہا ہو تو وہ گانے والا رہتا ہے نہ سپرنٹنڈنٹ قبلہ جب ان

محفلوں میں اقبال یا حالی کی غزل گانے تو اعلیٰ سوسائٹی کی خواتین پرس میں سے شیشہ نکال کر لپ اسٹک درست کرنے لگتیں اور قبلہ دل ہی دل میں لہولہان ہو جاتے مگر انکار کا بھی یارانہ تھا کہ بڑے بڑے لوگوں سے ہزاروں چھوٹی چھوٹی تمنائیں وابستہ کر رکھی تھیں۔ بچارے زہن کا گز بنے مارے مارے پھرتے۔ بارہا ایسا ہوا کہ جلتی دوپہر میں گھر سے نکلے۔ بائیسکل پنکچر ہو گئی۔ پیدل مارا مار کرتے میزبان کی کوٹھی پہنچے تو لنچ ختم ہو چکا تھا مگر میزبان نے دیکھتے ہی نعرہ بلند کیا کہ لیجئے قبلہ آ گئے اور قبلہ کے سر کا پسینہ چو کر ایڑی سے بہہ رہا ہے مگر گا رہے ہیں؛

کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں

میں قبلہ کے خاص نیازمندوں میں سے تھا اور ان کی خدمت میں اکثر حاضر ہوتا تھا۔ عام لوگوں کے سامنے تو وہ "احترام" کے اس پردے کو تانے رکھتے۔ لیکن میرے سامنے کلیجہ نکال کر ہاتھ پر رکھ دیتے۔ وہ اپنے اس مصرف پر بہت دکھ محسوس کرتے تھے۔ میں جب بھی حاضر ہوا تین چار دعوت نامے ضرور ان کے سامنے موجود ہوئے جن کو ترتیب وار میری طرف سرکاتے ہوئے فرماتے۔

"۱۳ر جولائی ...... شیخ صاحب قبلہ سرغیاں پالو کے جلسے میں گا رہے ہیں"

"۱۶ر جولائی والٹر لاک کے انگریز منیجر کی دعوت پر ......"

"۲۰ر جولائی ...... دعوت ولیمہ ......"

پھر ایک زہر خند کے ساتھ میری طرف دیکھتے اور مجذوبوں کی طرح زور سے نعرہ لگاتے

——— ہائے صبورا دائے شکورا! (صبورا اور شکورا ان کے بیٹے تھے)

ایک روز حاضر ہوا تو بیزاری کا عجیب عالم طاری تھا ——— وہی طائر

لاہوتی، بنے بیٹھے تھے لیکن برہمی کا اندازہ کہہ رہا تھا کہ آج ——— یا اپنا گریباں چاک یا دامنِ یزداں چاک!

مجھے دیکھتے ہی بڑے جذبے سے فرمایا ——— "جاؤ میاں کسی حجام کو پکڑ لاؤ۔"

"اس وقت حجام؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"ہاں بھئی ——— میں سوچ رہا ہوں یہ ڈاڑھی مونچھ مُنڈوا ہی ڈالوں۔"

"خیریت تو ہے قبلہ؟" ——— اور انہوں نے ایک لمبا چوڑا سنہرا دعوت نامہ میری طرف کھسکا دیا۔ لکھا تھا۔

"...... عزیزم کی رسمِ ختنہ پر ...... بتاریخ ...... بوقت ...... غریب خانہ پر ......"

نیچے کارڈ کے حاشیے میں "غریب خانے" کے کسی کلرک نے اپنے ہاتھ سے یہ نوٹ لکھ رکھا تھا ——— "قبلہ اگر آج یہ غزل تیار ہو سکے تو سبحان اللہ

وہ شوخ آج جس گھر میں مہمان ہو گا
قیامت کا اس گھر میں سامان ہو گا

یہ خود سرکار کی فرمائش ہے۔"

قبلہ نے میری طرف دیکھا تو میں سکتے میں رہ گیا۔ مجھے یقین تھا کہ قبلہ بھی سکتے ہی میں رہیں گے لیکن اس شام جب "ختنہ والی کوٹھی" کے سامنے سے میں گزرا تو نغمہ گونج رہا تھا

وہ شوخ آج جس گھر میں مہمان ہو گا

شیخ صاحب قبلہ خوانچہ لگائے بیٹھے تھے!

مشاعرہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

مرغ بازی —— بٹیر بازی وغیرہ کی طرح مشاعرہ کرانا یعنی مشاعرہ بازی بھی ایک لت ہے، میں خود گذشتہ پندرہ سولہ برس سے اس مرض میں مبتلا ہوں ابتدا میں محض خدمت ادب کے خیال سے ایک مشاعرے کی نیو رکھی تھی۔ بعد میں مشاعرے نے گویا اپنی نیو مجھ پر رکھ دی۔ چنانچہ اس مدت میں درجنوں ڈبلے پتلے موٹے تازے مشاعرے کرا چکا ہوں لیکن آج میں مشاعرہ سے توبہ کا اعلان کرتا ہوں اور اور اپنی اس تحریر کو گواہ بناتا ہوں تاکہ آئندہ اگر مشاعرے کو منہ دکھاؤں تو دنیا کو منہ نہ دکھا سکوں۔

لوگ عام طور پر مشاعرے کو بڑی آسان چیز سمجھتے ہیں حالانکہ آج کل مشاعرے اور الیکشن میں تھوڑا ہی فرق رہ گیا ہے۔ مشاعرہ ان دنوں کیا نہیں جاتا لڑا جاتا ہے میں نے تو اپنے انتظام کے ہر مشاعرے کے بعد کچھ اس طرح محسوس کیا ہے گویا مشاعرہ نہیں گولکنڈہ کا قلعہ سر ہوا ہے۔ مشاعرے کی مشکل ہی یہ ہے کہ وہ آسان معلوم ہوتا ہے۔

بعض ممالک کی طرح مشاعرہ بھی ہر وقت خارجی اور داخلی خطروں کی زد پر رہتا ہے اس کی موت عموماً "داخلی خطروں" یعنی خود شعراء کرام کے ہاتھوں واقع ہوتی ہے کسی انڈوپاک سطح کے مشاعرے میں ظاہر ہے کہ آپ گنتی ہی کے مقامی شعراء کو مدعو کر سکتے ہیں مگر وہاں شہر کا شہر شاعر ہوتا ہے اور شعراء کے بارے میں یہ تو خیر طے شدہ بات ہے کہ جو ذرّہ جس جگہ ہے وہیں آفتاب ہے۔ بلکہ لہو خورشید کا نکلے اگر ذرّے کا دل چیریں۔ آپ نے دیکھا ہوگا بعض مشاعروں میں شعراء وسامعین کی تعداد قریب برابر ہوتی ہے یہ مشاعرہ تو نہ ہوا ایک قسم کی "جمہوریت" ہوئی۔ ایسے موقعوں پر مشاعرہ کرنے کے بجائے یہ کہیں بہتر ہو کہ ایک ایک شاعر کو دو سامعین کے سپرد کر دیا جائے کہ لیجئے صاحب انہیں اپنے گھر لے جائیے یا پھر مشاعرے کا ایک پورا ہفتہ منعقد کیجئے جس میں شعراء وسامعین زندگی کے تمام کاروبار بند کر کے قومی پیمانے پر مشاعرہ پڑھیں اور سنیں۔

منتخب مقامی شعراء کو آپ یقیناً مدعو کرتے ہیں۔ ان کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں ان کی سواری کا انتظام کرتے ہیں مگر ان میں اکثر کا رویہ کچھ اس قسم کا ہوتا ہے کہ وہ گویا مدعو کئے جانے پر خفا ہو گئے ہیں۔ پہلے میٹھے میٹھے گلے، پھر دھیمی دھیمی شکایتیں اور آخر کار تند و تیز اختلافات حتّٰی کہ مشاعرے کے قریب قریب صرف چند جاں نثار شعراء ہی میدان میں رہ جاتے ہیں۔ صورت حال کچھ مغلوں کے عہد زوال کے ہندوستان کی سی ہوتی ہے۔ کبھی دکن میں شورش کبھی دہلی میں بغاوت کبھی ملتان میں فساد — اختلافات کچھ اس نوع کے ہوتے ہیں۔

۱۔ پوسٹر میں میرا نام باریک قلم سے لکھا گیا ہے۔

۲۔ میرا نام فلاں صاحب کے بعد لکھا گیا ہے۔

۳۔ فلاں صاحب مدعو کئے گئے ہیں۔

۴۔ فلاں صاحب مدعو نہیں کئے گئے۔

۵۔ میں موٹر میں کسی دوسرے کے ساتھ بیٹھنا پسند نہیں کرتا۔

۶۔ اچھا آپ نے مجھے مقامی شاعر سمجھ لیا!

۷۔ انجمن ضیاء الادب کے سب شعراء کی شرکت ضروری ہے اور ان کی گنتی ڈیڑھ سو سے اوپر ہے۔

۸۔ میں نے ۴۵ اعزازی کارڈ طلب کئے تھے۔

۹۔ میں طرحی مشاعرے کا قائل نہیں۔

۱۰۔ میں غیر طرحی مشاعرے کا قائل نہیں۔

۱۱۔ میں مشاعرے ہی کا قائل نہیں۔

الغرض آخر دم تک کچھ پتہ نہیں چلتا کہ کون صاحب آرہے ہیں، کون نہیں لیکن جب پتہ چلتا ہے تو آپ یہ دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں کہ جو اصحاب دو ٹوک معذرت کر چکے تھے ان ہی سے بیشتر تشریف لے آتے ہیں اور جن کی شرکت یقینی تھی ان میں سے اکثر کا کوئی سراغ نہیں۔

اس آنے کو کیا کہیئے اس جانے کو کیا کہیئے

بیرونی اسٹار شعراء کے اپنے پرابلم ہیں۔ پہلے تو ان کے انتخاب پر خود انتظامیہ کمیٹی کے اندر وہ ہنگامہ بپا ہوتا ہے کہ عموماً انتظامیہ کمیٹی ہی ٹوٹ جاتی ہے۔ جو مشاعرہ اس مرحلے سے بچ نکلا وہ مشاعرے سے زیادہ ترنم اور تحت اللفظ سامعین اور

مائیکروفون کارکنوں اور سرپرستوں اور نہ جانے کن کن مجبوریوں اور مصلحتوں کے درمیان ایک عجیب و غریب سمجھوتہ ہوتا ہے۔

شعراء سے خط و کتابت بجائے خود ایک دلچسپ چیز ہے۔ ان خطوط سے اپنے دور کی ایک نہایت قیمتی سوانحی دستاویز مرتب کی جا سکتی ہے۔ مثلاً:

۱۔ میں فرسٹ کلاس میں سفر کرتا ہوں۔

۲۔ میں غروب آفتاب کے وقت "کافی" پیتا ہوں۔

۳۔ میں سالن میں مرچیں تیز کھاتا ہوں۔

۴۔ میں "کریون اے" کے سگریٹ پیتا ہوں۔

۵۔ کیا بستر ساتھ لانا ہوگا۔

۶۔ مجھے چھٹی دلانے کے لئے پنڈت نہرو کو فون کیجیے۔

میں سمجھتا ہوں مشاہیر کے بارے میں اس قسم کی باتیں ضبطِ تحریر میں آجانی چاہیں کہ یہی چھوٹی چھوٹی باتیں بعد میں تاریخی باتیں بن جاتی ہیں۔ مگر افسوس ان باتوں کو واشگاف لکھنے کی ہمیں جرأت نہیں۔ اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ خط و کتابت سے آپ بیرونی شعراء کے تمام پرابلم طے کر سکتے ہیں تو میں سمجھوں گا کہ آپ کو مشاعرہ کرانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ شعراء نہ خود تفصیل سے لکھتے ہیں نہ دوسروں کی تفصیل پہ توجہ دیتے ہیں۔ لہٰذا آپ خواہ کچھ کریں بعض پرابلم بہ نفسِ نفیس شاعر کے ساتھ ہی وارد ہونگے۔

آپ جناب سیمابی اور جناب تمنائی کو بہ صراحت لکھ چکے تھے کہ پروگرام میں گڑبڑ ہو تو آپ سیدھے میٹروپول ہوٹل میں تشریف لے آئیں جو ریلوے اسٹیشن کے سامنے واقع ہے۔ وہاں آپ کے لئے کمرہ مخصوص ہے۔ مشاعرہ شروع ہو چکا مگر سیمابی و تمنائی

کا کوئی پتہ نہیں۔ آپ سمجھتے ہیں وہ تشریف نہیں لاتے۔ اتنے میں خبر ملتی ہے کہ سینائی صاحب باہر گیٹ پر کھڑے ہیں اور دو تانگوں میں سامان لدا ہے شہر سے کوئی صاحب فون کرتے ہیں کہ تمنائی صاحب گلی مائی تابو میں ذکی الدین صاحب کے ہاں تشریف فرما ہیں۔ ادھر آپ کے فرشتوں کو بھی معلوم نہیں کہ گلی مائی تابو کہاں ہے اور ذکی الدین صاحب کون بزرگوار ہیں۔

شباب صاحب مشاعرے سے کوئی دس پندرہ منٹ پہلے پہنچ تو گئے ہیں مگر معلوم ہوا کہ ابھی حجامت بنوانی ہے۔ شیروانی پر استری کروانی ہے۔ قمیض سرے سے سامان میں کوئی لائے ہی نہیں اور ہاں طرحی غزل میں مصرع طرح کے سوائے الحال کچھ کہہ بھی نہیں سکے۔

بعض لوگ (اگرچہ بہت شاذ) تعجیل کے پرابلم پیدا کرتے ہیں۔

مشاعرے میں چھ سات روز باقی ہیں آپ رات کے دس بجے باہر سے گھر لوٹتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ برآمدے میں بکسوں، گٹھڑیوں اور بوریوں کا انبار لگا ہے اور ڈرائینگ روم میں تین چار اجنبی آدمی بیٹھے چلغوزے کھا رہے ہیں۔

"خاکسار کو نغمہ قرطاس پوری کہتے ہیں"

"اخاہ! نغمہ صاحب" اور آپ ان سے لپٹ جاتے ہیں کیونکہ اگر آپ ان سے نہیں لپٹیں گے تو وہ آپ سے لپٹ جائیں گے۔ حالانکہ اس سے پہلے آپ نغمہ صاحب سے کبھی نہیں ملے۔ نہ ان کا فوٹو ہی کبھی دیکھا تھا۔ کیونکہ نغمہ صاحب مشاعرے کے ان ستاروں میں سے ہیں جن کو ادبی رسائل کے ایڈیٹر چھاپنا کبھی پسند نہیں کرتے۔ بہر کیف نغمہ صاحب تشریف لے آئے تھے۔ معلوم ہوا پچھلے

اتوار اوکاڑہ میں مشاعرہ تھا۔ انہوں نے سوچا لاؤ پابہ رکاب۔ دوسرا مشاعرہ بھی بھگتا آؤ۔ احباب (؟) سے ذرا گپ شپ ہی رہے گی اور یہ دو تین صاحبان نغمہ صاحب کے سخن فہم دوست ہیں جن کو آپ زبردستی گھسیٹ لائے ہیں۔ ویسے وہ بنولوں کی آڑھت کرتے ہیں۔ چنانچہ "نمونے" کی بوریاں باہر برآمدے میں پڑی ہیں۔

جو شعراء پروگرام کے مطابق پہنچ چکے ہیں اور آپ کو اطمینان ہے کہ وہ آپ کے قابو میں ہیں۔ ان میں سے اکثر ٹھیک مشاعرے کی شام کو بے قابو ہو کر گھومنے نکل جائیں گے۔ کہاں گئے، کب واپس آئیں گے کچھ معلوم نہیں۔ واپس آئے تو بعض اس حالت میں ہیں کہ اب آپ مشاعرے ہی کو ان تک لے آئیں ورنہ وہ تو سود و زیاں ہوش و خرد بلکہ زمان و مکان اور ہستی و نیستی وغیرہ کی منزلوں سے بھی گویا بہت آگے نکل چکے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ سیکرٹری بچارے نے زیادہ تر چورا چار اسمیٹ کر، یا پھر ان چند شعراء کے آسرے پر مشاعرہ شروع کر دیا جن سے ابھی تک مشاعروں کی کچھ ساکھ باقی ہے۔ دوسرے شعراء رفتہ رفتہ جیسے جیسے کوئی ملتا گیا شروع سے آخر تک ایک ایک کر کے، قطرہ بہ قطرہ، مشاعرے میں پہنچتے رہے۔

بعض شعراء وقت کی پابندی کو اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ خوب جما ہوا مشاعرہ جب تک ان کی آمد کے غلغلے میں درہم برہم نہ ہو وہ اپنی آمد ہی کو بے معنی سمجھتے ہیں یہ اصول گویا عروج کے مسلمات میں سے ہے کہ جتنا بڑا کوئی شاعر ہے اتنی ہی دیر سے وہ مشاعرے میں پہنچے۔ یہاں مجھے بے اختیار علامہ ہیبت یاد آجاتے ہیں یاد کیا آجاتے ہیں میں ان کو بھول ہی نہیں سکتا کیونکہ وہی تو دراصل مشاعرہ بازی سے

میری توبہ کا باعث ہوئے۔ میں تو ایک طرح سے ان کا احسان مند ہوں۔ بلکہ ایک میں کیا جملہ سامعین کو بھی ان کا شکر گزار ہونا چاہیئے کیونکہ میں نہیں سمجھتا کہ آئندہ کم از کم اس شہر میں کوئی مشاعرہ ہو بھی سکے گا۔ یہ نکتہ قدرے تفصیل چاہتا ہے مشاعرے میں اجمال کا کیا کام؟

علامہ ہیبت ہمارے مشاعرے کے سب سے بڑے شاعر تھے وہ زندگی میں پہلی مرتبہ ہمارے شہر میں آ رہے تھے۔ ہم میں سے کوئی بھی ذاتی طور پر ان سے واقف نہ تھا البتہ ان کی نازک مزاجی، غصہ دری اور بد دماغی سے متعلق طرح طرح کی ہولناک روایات ضرور مشہور تھیں لوگ کہتے تھے ان کو مدعو کر لینا کوئی کمال نہیں ہاں ان کو سنبھال کے رکھنا واقعی ایک کارنامہ ہے ـــــ بعض لوگ اعداد و شمار سے ثابت کرتے کہ ان کی شرکت کی بدولت جتنے مشاعرے برباد ہوئے ہیں اتنے کامیاب ہر گز نہیں ہوئے ہمیں ان باتوں کا یقین ہر گز نہ آتا۔ جیسی جیسی نازک مزاجیاں ان سے منسوب کی جا رہی تھیں اس زمانے میں ایسے شخص کا ساٹھ برس تک زندہ رہنا ہی محال تھا مگر لوگ بھی سچ ہی کہتے ہیں۔

پوری مجلس انتظامیہ علامہ کے استقبال کے لئے ریلوے اسٹیشن پر موجود تھی علامہ تشریف لائے تو ایک ملازم کے علاوہ دو مصاحب بھی ان کے ہم رکاب تھے جن کی ہمیں کوئی اطلاع نہ تھی۔ ویسے صورت و حیثیت میں یہ دونوں مصاحب کلٹن نواب اور نجومرزا ان کے ملازم سے کچھ بہتر نہ تھے۔ بہر حال پہلے بڑھ کر میں نے اپنا تعارف کرایا پھر کمیٹی کے دوسرے ارکان کو علامہ کی خدمت میں پیش کیا۔

"مسٹر اعجاز علی ٹرانسپورٹ افسر"

"خوب"

"مسٹر علی حیدر فارسٹ افسر"

"خوب"

"خواجہ مصباح الدین میونسپل کمشنر"

"خوب"

"میجر ڈبلیو، زیڈ خان نائب صدر"

"خواجہ، اور آپ کے صدر کون ہیں؟" علامہ نے دریافت فرمایا۔

"کمشنر صاحب" ہم نے بڑے فخر سے جواب دیا۔

"تو کمشنر صاحب کہاں ہیں؟"

"وہ دورے پر ہیں" میجر خان فوراً بولے۔

"دورے پر!؟" علامہ چونک کر بولے "کیا وہ مشاعرے کی صدارت نہیں کر رہے ہیں؟"

"صدارت تو کر رہے ہیں مگر وہ کمشنر بھی ہیں۔" میجر خان نے جن کو اس سے پہلے کبھی کسی مشاعرے سے کوئی سروکار نہیں رہا تھا دو ٹوک لہجے میں کہا۔

"مگر میں اس توہین کا عادی نہیں ہوں۔" علامہ بھڑک اٹھے۔

"قبلہ مجبوری تھی۔ اچانک ایک اہم سرکاری کام نکل آیا۔" میں نے خیر سگالی کے مشن پر ایک جملہ بھیجا۔ "ویسے شام کو وہ یہیں ہوں گے۔"

"کچھ بھی ہو۔ ہماری طبیعت مکدر ہو چکی ہے۔ نبو مرزا سامان اسی گاڑی میں رکھ دو ہم یہاں نہیں اتریں گے۔"

یہ سن کر ہمارے قدموں تلے سے گویا پلیٹ فارم ہی نکل گیا وہ تو یہ کہیئے کہ اس موقع پر میونسپل کمشنر صاحب جو سینکڑوں انتخابی معرکوں میں سے نکلے ہوئے تھے کام آگئے اور انہوں نے منت سماجت کر کے علامہ کو راضی کر لیا ورنہ علامہ ہمارے ہاتھ سے نکل ہی گئے تھے۔

ہوٹل میں پوری مجلس انتظامیہ ان کی خدمت میں حاضر رہی۔ شام کو ہم لوگ جوائنٹ سیکرٹری عابد کو ان کی خدمت میں حاضر کر کے پنڈال میں آگئے۔ میں علامہ کو خطوط میں لکھ چکا اور اب بھی عرض کر آیا تھا کہ آپ نو بجے تشریف لائیں گے میں جانتا تھا کہ میں نو کہوں گا تو وہ کہیں دس بجے آئیں گے خود ہمارا ارادہ بھی مشاعرے کو نو بجے ہی شروع کرنے کا تھا مگر کمشنر صاحب نے وقت کی پابندی ضروری سمجھی اور اعلان کے مطابق ٹھیک آٹھ بجے مشاعرے کی کاروائی شروع کر دی۔ نو بج گئے دس بج گئے مگر علامہ کا کوئی پتہ نہ تھا۔ اتنے میں ہوٹل سے ایک آدمی میرے نام یہ پیغام لایا کہ تم فوراً پہنچو علامہ خفا ہو گئے ہیں۔ پس پہنچا تو عابد پورچ میں کھڑا تھا۔ اس نے بتایا کہ ساڑھے آٹھ بجے تک تو علامہ اور مصاحبین خوب دھواں دھار کافی پیتے رہے اور نہایت اچھے موڈ میں تھے۔ پھر میں ان کا ڈنر لگوانے گیا۔ واپس آیا تو انہوں نے کہا کہ سرکار نے ہدایت کی ہے کہ بارہ بجے سے پہلے ان کو ہرگز نہ جگایا جائے میں سوچا بارہ بجے تو ادھر کمشنر صاحب مشاعرہ ہی برخاست کر دیں گے لہٰذا پونے دس بجے میں نے خود ہی ہمت کر کے ان کو جگا دیا کہ حضرت ڈنر تیار ہے مگر اس پر وہ سخت برہم ہو گئے ہیں کہتے ہیں میں مشاعرے میں جاتا ہی نہیں۔

"قطعی انکار؟" میں نے پوچھا۔

"ان کی طرف سے تو یہی معلوم ہوتا ہے۔" عابد بولا۔ "البتہ کلن نواب کہہ رہے تھے کہ اگر سیکرٹری صاحب خود آجائیں تو شاید بات بن جائے۔"

"اچھا اب میں کوشش کر دیکھتا ہوں۔ تم یوں کرو کہ تھوڑی سی اور کافی بھجوا دو۔"

"اور کافی!" عابد حیران ہو کر بولا۔

کافی ہی نے تو.....

"تم نہیں سمجھتے —— درد کا حد سے گزرنا ہے....."

میں کمرے میں پہنچا تو علامہ تکیے کو دونوں ہاتھوں میں سمیٹے ہوئے پلنگ پر دراز تھے میں نے پوچھا۔

"خیریت تو ہے قبلہ؟"

قبلہ نے یہ سن کر کروٹ لی اور منہ دیوار کی طرف پھیر لیا۔

"سیکرٹری صاحب تشریف لائے ہیں سرکار۔" نجومرزا نے سفارش کی۔

"ہوں۔" سرکار دیوار ہی کی طرف سے بولے۔ "معاف فرمایئے سیکرٹری صاحب۔

"جو چیرا تو اک قطرۂ خون نکلا۔"

"جی ہاں معاف فرمایئے۔" کلن نواب بولے۔ "اب چڑیاں چُگ گیئں کھیت۔"

"مگر کچھ معلوم تو ہو قبلہ؟"

"کیا ابھی کچھ کہنے کی ضرورت ہے؟" قبلہ منہ پھیرتے ہوئے بولے۔

"سیکرٹری صاحب آپ کے جوائنٹ سیکرٹری صاحب نے سر شام ہی مجھے بیدار کر دیا۔"

"مجھے بڑا افسوس ہے۔"

"ایسا تکدر تو کہیں صدیوں میں پیدا ہوتا ہے طبیعت میں۔" تبھو مرزا بولے:

"میں بہت شرم سار ہوں آپ سے۔"

"ہم ان سے کہتے بھی رہے کہ سرکار بارہ بجے تک آرام فرمائیں گے مگر۔۔۔۔"

"مجھے بے حد افسوس ہے مگر قبلہ دراصل اس بے چارے کا بھی گناہ نہیں ہم لوگ مشاعرہ آٹھ بجے شروع کر کے بارہ بجے ختم کرنے کا اعلان کر چکے ہیں۔"

"سبحان اللہ! یہ عجیب مشاعرہ ہے جو بارہ بجے ختم بھی ہو جائے گا تو اور سنو تبھو مرزا!"

"مشاعرہ تو بارہ بجے کہیں شروع ہوتا ہے مرزا نے گرہ لگائی۔"

"بجا فرمایا، مشاعرہ تو واقعی بارہ بجے شروع ہوتا ہے۔ لیکن۔۔۔۔"

اتنے میں بیرا کافی لے کر آگیا اور میں نے ایک پیالہ بنا کر پیش کرتے ہوئے کہا:

"قبلہ آپ تھوڑی سی کافی نوش فرمائیں۔ میں آپ کے چہرے پر ابھی تکان کے آثار دیکھ رہا ہوں۔"

اس پر علامہ سنبھل کر بیٹھ گئے۔ دو گھونٹ لینے کے بعد انھوں نے پاؤں فرش پر رکھ دیئے اور تبسم سے پر بولے۔

"مجھے تو دس بجے بھی چلنے میں کوئی عذر نہ تھا۔ لیکن بعض نامعقولیتوں کو میں برداشت نہیں کر سکتا۔"

"جی۔"

"اور حضرت کیا وہ آپ کے کمشنر صاحب بھی تشریف لائے ہیں یا دورے ہی پر ہیں؟"

"جب میں آیا ہوں اس وقت مشاعرہ کی صدارت فرما رہے تھے۔ اس وقت کا کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

"کیوں؟" قبلہ نے دریافت فرمایا۔

"قبلہ وہ تو صرف آپ ہی کو سننے کے مشتاق تھے"

"تو گویا سخن دوست انسان ہیں"

"آپ ان سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔ کل دوپہر کو آپ کے لنچ کے لئے بھی کہہ رہے تھے"

"ہُنہ کیا کہتے ہو برخوردار؟"

"میں کیا عرض کر سکتا ہوں قبلہ ویسے لوگوں کو سخت مایوسی ہوگی"

"اچھا تو میں چلتا ہوں" علامہ یکبارگی اٹھ پڑے۔ "بھئی مجھ سے لوگوں کی مایوسی نہیں دیکھی جا سکتی"

نبھو مرزا میری شیروانی، ٹوپی، جوتا......

میں سمجھا اب میدان مار لیا۔ لیکن تیار ہونے کے بعد علامہ نے ایک خاص ادائے بے نیازی کے ساتھ تین چار بیاضیں نبھو مرزا اور کلن نواب کے سامنے پھینک دیں کہ بتاؤ کون کون سی غزل رہے اور اب غزلوں کے انتخاب پر جو بحث چلی ہے تو قصہ کوتاہ جب میں علامہ کو لے کر پنڈال میں پہنچا ہوں تو ایک بج گیا تھا۔ کمشنر صاحب مشاعرے کو ایک پرنسپل صاحب کے سپرد کر کے تشریف لے جا چکے تھے اور پرنسپل صاحب بپھرے ہوئے سامعین کے نام بار بار امن کی اپیلیں جاری کر رہے تھے اور سامعین چلا رہے تھے۔

"ہمارے پیسے واپس کرو؟"

"ہمارے پیسے واپس کرو؟"

بدقسمتی کی انتہا یہ ہوئی کہ علامہ کو دیکھنے کے بعد بھی سامعین بدستور بپھرے رہے

کیفیت یہ تھی کہ علامہ مطلع پڑھ رہے ہیں کہ ـــــ یاروں کے لئے گردشِ ایام

بہت ہے ـــــ اور لوگ نعرے لگا رہے ہیں کہ:

"ہمارے پیسے واپس کرو!"

"ہمارے پیسے واپس کرو!"

دراصل ریلوے اسٹیشن پر علامہ کے روٹھنے کی خبر جنگل کی آگ کی طرح شہر میں پھیل چکی تھی۔ چنانچہ بہت سے لوگ یہی سمجھ رہے تھے کہ ہم نے ڈاڑھی مونچھ پر رام پوری ٹوپی رکھ کر کوئی نقلی آدمی کھڑا کر دیا ہے۔ سب سے مزے دار لطیفہ مشاعرے کے بعد اس وقت ہوا جب نجھو مرزا نے مجھ سے لپٹتے ہوئے کہا۔

"بھائی صاحب مبارک ہو خدا کی قسم یہ تو معجزہ ہوا ہے۔ جو سرکار مشاعرے میں تشریف لے آئے۔"

اور میجر ڈبلیو، زیڈ خان جو پاس ہی پائپ روشن کر رہے تھے زور کا ایک قہقہہ لگا کر کہا۔

"مائی گاڈ ـــــ واٹ اے فنی لاٹ ہول آف دیم"

ہم لوگ

ہمارے گروپ میں زیادہ تر ادیب، شعراء، فن کار اور دانش ور شامل تھے جو دن بھر ایک باقاعدہ بے قاعدگی کے ساتھ کسب معاش کا دھندا کرتے۔ رات کو بڑے خلوص کے ساتھ شہر کے مختلف قہوہ خانوں میں گپ لڑاتے اور اس کے بعد جو وقت بچ رہتا اس میں ادب، آرٹ، دانش وغیرہ کی تخلیق کرتے۔ بعض فن کار، فن کو زندگی سے اتنا مقدم سمجھتے تھے کہ زندگی خود ان کی گرفت سے نکل گئی تھی۔ چند بڑے افسر بھی گروپ میں شامل تھے جو اگر بڑے افسر نہ ہوتے تو بہت چھوٹے آدمی ہوتے۔ ان کے علاوہ کچھ ایسے لوگ تھے جو بظاہر زندگی کے ایسے شعبوں سے تعلق رکھتے تھے۔ جن کا ادب اور آرٹ سے کوئی تعلق نہ تھا۔ مگر وہ ادب اور آرٹ کے سرپرست سمجھے جاتے تھے، پھر بعض متفرق قسم کے افراد جو نہ معلوم کیوں، کب اور کس طرح مجتمع ہو کر گروپ میں در آئے تھے مگر اب اس کا جزو بن چکے تھے۔

آزادی سے پہلے ہم لوگ عموماً مختلف ہوٹلوں اور قہوہ خانوں میں بیٹھتے تھے۔

آزادی کے بعد جب پرانی قدریں بدلنے لگیں تو شہر کے بڑے کلب کے دروازے بھی ہم پر کھل گئے۔ جب یہ دروازے کھلے تو یوں محسوس ہوا تھا جیسے ہم پر جنت کے دروازے کھل گئے ہوں۔ ہم میں سے بعض کو آزادی وطن کی تمنا ہی محض اس لئے تھی۔ کہ بڑے کلب میں داخل ہونے کی آزادی مل سکے گی مگر جب وہاں داخل ہوئے تو بہت جلد باہر نکلنے کی آرزو نے بے چین کر دیا۔ کلب کے خلاف ہمارے گروپ میں ہزار دلے اعتراضات پیدا ہو گئے۔ ہزاروں تو خیر میں نے یونہی اجمالاً کہہ دیا۔ تفصیل میں موٹے موٹے اختلافات چار پانچ سے زیادہ نہ تھے۔ مگر ہاں غم و غصہ ہزار ہا اختلافات سے بھی زیادہ تھا اس پر گروپ کا "قومی مزاج" کچھ اس قسم کا کہ ہم کسی ایک اختلاف پر بھی کلب کو توڑ کر پھر اسی دیوار پر جا بیٹھتے جہاں سے کچھ پہلے کلب کے جگمگاتے ہوئے چھری کانٹوں کو دیکھا کرتے تھے۔

ہمارے نقطۂ نگاہ سے کلب میں بعض بہت بڑی قباحتیں اصلاح طلب تھیں۔ بنیادی قباحت کلب کا معیار تھا جو اتنا اونچا نکل گیا تھا کہ زندگی کلب سے باہر چلی گئی تھی۔ کم از کم قومی سانچے میں ڈھلی ہوئی جس بھرپور مخلصانہ زندگی کو ہم سینے سے لگائے پھرتے تھے۔ وہاں اس کے تصور کی بھی گنجائش نہ تھی۔ فرنگی تو فرنگی، خاص اپنے لوگوں کا یہ عالم تھا کہ ابھی تک یورپ سے واپس نہیں آئے تھے۔ جو یورپ نہیں جا سکے تھے۔ وہ بادر جہاز بیٹھے تھے۔ یہ لوگ عموماً موسم اور کلچر پر بحث کرتے تھے جو ہوتے ہوتے اس قدر آسان ہو چکی تھی کہ صاحب لوگوں کے اٹھ جانے کے بعد بیرا لوگ بھی موسم اور کلچر پر بحث کر لیتے تھے۔ یہ لوگ ایران کے قالین و سمور سے واقف تھے مگر ایران کے حافظ و سعدی سے بے خبر۔ وہ ہم میں سے ضرور تھے مگر ہماری طرح کے ہرگز نہیں تھے۔

کلب کے مشروبات وماکولات میں سے بیشتر چیزیں عقیدہ وتوفیق کی مجبوریوں کے باعث ہماری دلچسپی سے خارج تھیں۔ ایک سے ایک بڑھیا اور مفرح دیسی شربت بازار میں موجود تھا مگر بوتلوں کی صورت ایسی واہیات تھی کہ ان کے بار پانے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ درجنوں قسم کے کھانے وہاں ضرور مل جاتے تھے اور ان میں سے بعض یقیناً مزیدار بھی تھے مگر ان لاطینی کھانوں کے ساتھ جب تک پیرس کے "الجزائر کلب" کی چہل پہل پر تبصرہ نہ کیا جائے یوں محسوس ہوتا گویا ہم کھانے کو نہیں۔ کھانا ہمیں کھا رہا ہے۔ ادھر اپنا یہ عالم کہ لے دے کر ترنم کے ساتھ اشعار پڑھ سکتے تھے، سو اس میں یہ بجوگ آپڑا تھا کہ چھری سے کاٹ لینے کے بعد نوالے کا ریزہ کانٹے کی نوک پر اتنی مدت تک ٹک ہی نہ سکتا کہ آدمی اطمینان سے شعر سنا سکے یا جھوم سکے۔

شربت کے تذکرے سے یہ نہ سمجھئے کہ ہیئت وصورت کی قید بوتلوں تک ہی محدود تھی۔ ممبروں پر لازم تھا کہ وہ اچھی وضع قطع کے ساتھ کلب میں آئیں۔ انسان اندر جا ہے جیسا کچھ بھی ہو۔ لباس ضرور عمدہ ہو۔ بوتل شربت سے زیادہ اہم تھی۔ آزادی کے بعد اگرچہ کلب کے قوانین شیروانی پاجامے پر بھی اتر آئے تھے مگر ہم پر یہ پابندی بھی سخت گراں تھی۔ گروپ کے اصحاب الرائے کے نزدیک تفریح کو اگر لباس میں جکڑ دیا جائے تو چہرا چمک اٹھتا ہے۔ روح مرجاتی ہے۔ اختلاف فروعی نہیں اصولی تھا۔ جہاں عام لوگ لباس کو زینت سمجھتے تھے وہاں ہمارے "مردان حر" اس کو زحمت ومشقت گردانتے تھے ؎

کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالہ کی حنابندی

انتظامیہ کو ایک مرتبہ خیال آیا شاید یہ لوگ گھر سے آئینہ دیکھ کر نہیں نکلتے اس پر کلب کے برآمدے میں دو تین قد آدم آئینے نصب کر دیئے گئے، مگر فن کار ممبر جب

آئینے میں اپنی ہیئت دیکھ کر اس پر الٹا اظہار اطمینان کرنے لگے تو دوسرے ممبر مارے حیرت کے آئینہ بن گئے۔

مغربی رقص و موسیقی کا معاملہ بھی عجیب تھا۔ جب تک ہم کلب کی بیرونی دیوار ودر پر سے دیکھتے، سنتے تھے، یہی رقص، یہی موسیقی ایک آسمانی نعمت معلوم ہوتی تھی۔ قریب پہنچے تو اس رقص و موسیقی سے جان چھڑانا مشکل ہوگیا۔ رقص میں تو خیر پھر بھی ایک کیفیت تھی لیکن موسیقی نہایت وحشت آفریں ثابت ہوئی۔ رقص کے کسی نقطہ پر جب ذرا محفوظ ہونے لگتے تو گروپ کے بعض ممبر، جو انتظام حکومت میں تو کوئی آواز نہیں رکھتے تھے مگر اپنی جگہ نظام حکومت کا پورا فلسفہ منضبط کئے بیٹھے تھے، اس سرور کو فسق و فجور کی تعریف میں لے آتے۔

ایک مرتبہ ہم نے کلب میں اردو ڈرامہ کھیلنے کی تجویز پیش کی تو دوسرے ممبروں نے تجویز کے ساتھ ہمیں بھی حقارت کی نظر سے دیکھنا شروع کر دیا۔ بہت زور دینے پر اس شرط کے ساتھ اجازت ملی کہ اولاً پروگرام دو گھنٹے سے زیادہ نہ ہو اور ثانیاً پروڈکشن کی نگرانی بوڑھی مس شیپ شینک کے سپرد ہوگی تاکہ کلب کی شہرت پر حرف نہ آنے پائے۔ اپنے کلچر کی خدمت کے خیال سے ہم نے یہ شرط بھی قبول کرلی مگر کلب کے ہموار و ناہموار، متضاد و متصادم رجحانات کے طفیل تجویز کا بقول شخصے وہی حشر ہوا کہ ؎

حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

ہوا یہ کہ پہلے تو سرے سے کوئی ایسا ڈرامہ ہی ملنے میں نہ آیا جو ڈرامہ بھی رہے اور دو گھنٹے کیا معنی چار گھنٹے میں بھی ختم ہو سکے۔ ناچار گروپ کے ایک تمثیل نگار نے جو مقامی آغا حشر کے لقب سے مشہور تھے، جہانگیر اور نورجہاں کے تاریخی معاشقے کے تار و پود

پھیلا کر خود ہی ایک ڈرامہ تصنیف کر ڈالا یہ شان جہانگیر عرف کابلی معشوقہ یہ مصنف آخر خود ڈرامہ نگار ہی تھا مورخ نہ تھا اس لئے ڈرامہ میں بعض تاریخی غلطیاں رہ گئی تھیں تاہم بحیثیت مجموعی ڈرامہ ایسا برا بھی نہ تھا۔ البتہ پُر جوش مصنف نے مغلوں کی عظمت وشوکت اور رنگینی پر جو دریا دلی صرف کی تھی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سات آٹھ قلعوں، پندرہ بیس جرنیلوں اور تیس چالیس پری جمال کنیزوں کے بغیر جہانگیر ٹہلنے پر بھی آمادہ نہ ہوتا تھا۔ مزید برآں اکبر کو تو خیر وہاں ہونا ہی چاہیئے تھا مگر تمہید کے طور پر بابر اور ہمایوں، بیرم خاں اور کوئی میرزا کو کا بھی اسٹیج پر چلے آئے تھے۔ جہانگیر کے دربار میں استاد عرفی اور طالب آملی کا مشاعرہ بھی دکھایا گیا تھا کہ ع

بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر!

شیپ شینک بڑی ذہین خاتون تھیں، مدتوں لندن کے ایک ممتاز تھیٹر میں کام کر چکی تھیں۔ ہم نے اپنے ڈرامے کا پس منظر، کاسٹ اور مطالبات ان کے سامنے رکھے تو بھونچکا سی رہ گئیں۔ دانتوں میں انگلی دبائے ہوئے بولیں یہ ڈرامہ تو شہنشاہ جہانگیر کی ذاتی سرپرستی ہی میں کھیلا جا سکتا ہے۔ کاسٹ کی وضع قطع متعین کرنے کے لئے ہم نے مغلوں کی جو تصویریں پرانے کیلنڈروں میں سے کاٹ کر جمع کی تھیں ان سے بیچاری شیپ شینک کو یہی سمجھ میں نہ آتا کہ ان میں بابر کون ہے اور جہانگیر کون ؟ کاسٹ کے لئے ملے جلے اداکار اکٹھے کئے گئے تو ہر خاتون نورجہان بننے پر مصر تھی۔ ری ہرسل شروع ہوئی تو معلوم ہوا کہ کانونٹ سکولوں میں پڑھی ہوئی یہ بیبیاں ڈرامے کے پرشکوہ مکالمے ادا کرنے تو درکنار ٹھیک سے پڑھ بھی نہیں سکتیں۔ ماحصل یہ کہ ایک دن ہم جس نورجہاں کو گھیر گھار کر لاتے مکالموں کے خوف سے وہ دوسرے دن

بھاگ جاتی۔ جہانگیر موجود۔ نورجہاں غائب۔ ایک نسبتاً قدامت پسند کنبے کی قدرے روشن خیال لڑکی درمیان میں ایسی بھی مل گئی تھی جو اردو بے تکلف پڑھ بول سکتی تھی مگر اسے جہانگیر کا والہانہ انداز میں لپک لپک کر نورجہان کی طرف پیش قدمی کرنا سخت ناگوار تھا۔ وہ صرف کسی ایسے مرنجان مرنج جہانگیر کو برداشت کر سکتی تھی جو دربار لگانے کے بجائے بازار میں خوانچہ لگاتا ہو۔

خارجی موانع کے علاوہ رفتہ رفتہ داخلی شاخسانوں نے بھی سر اٹھانا شروع کیا ایک ریسرچ سکالر نے اعتراض کیا کہ یہ جو پورے چھ فٹ کا جہانگیر ٹہلنے کو چھوڑ دیا گیا ہے۔ فی انچ لغو چیز ہے۔ فرشتہ کے بیان کے مطابق جہانگیر کا قد پانچ فٹ سے زیادہ نہ تھا۔ ہمارے لئے یہ مشورہ بوجوہ ناقابل عمل تھا۔ پانچ فٹ کا جہانگیر دیکھ کر پوری قوم کے احساسات مجروح ہوتے تھے۔ پانچ فٹ کے جہانگیر کی عظمت بحال رکھنے کے لئے اپنے پانچ فٹ کے مان سنگھ اور شائستہ خان اور خافی خان کہاں سے پیدا کرتے؟

پورے میک اپ کے ساتھ ریہرسل ہو رہا تھا کہ اتفاقاً اس روز کرنل فردوسی تشریف لے آئے۔ کرنل صاحب کا نام تو کچھ اور تھا مگر ایران میں مدت تک رہنے نیز فارسی ادبیات سے گہرے شغف کے باعث دوستوں کے حلقے میں وہ کرنل فردوسی کے نام سے مشہور تھے۔ ریہرسل میں جب عرفی اور طالب آملی عصا ٹیکتے ہوئے اسٹیج پر نمودار ہوئے تو کرنل صاحب نے پوچھا:

"دوہری کمر والے یہ سفید ریش بزرگوار کون ہیں؟"

"ملک الشعراء استاد عرفی"

"ہائیں!" کرنل صاحب بیتاب ہو کر اچھل پڑے یہ عرفی ہے، کیسا عرفی؟

ارے کون سا عرفی ہے یہ؟"

"جی! وہی طالب آملی والا عرفی، مصنف نے جواب دیا۔" وہی۔ آواز سگاں کم نہ کند رزق گدا را۔ والا عرفی۔"

"غالباً کرنل صاحب کو عرفی کی لمبی رومی کلاہ پسند نہیں آئی۔"

"فکر کا بات نہیں۔" مس شیپ شیٹنگ نخرابی کا اندازہ کرتے ہوئے بولیں۔" ہم اس کا ڈاڑھی اور لمبا کر دے گا۔"

"نہیں سمجھے!" کرنل فرودی بڑے کرب کے ساتھ بولے۔" ظالمو! یہ کیا اپ گور قسم کا عرفی گھڑ لائے ہو۔ ارے میاں! عرفی تو ایک روایت کے مطابق اڑتیس اور دوسری کے مطابق انتالیس برس کی عمر میں مر بھی چکا تھا!"

"مگر حضور سنیئے تو ——— مصنف اپنی صفائی پیش کرنے لگا۔" غم جاناں و غم دوراں میں کسی جینیئر نے بیس ہی برس میں عرفی کی کمر دوہری اور بال سفید کر دیئے تھے۔"

"جی ہاں" ایک شاعر صاحب بولے۔" خیال رہے کہ عرفی شاعر تھا فوج کا حوالدار میجر کالا خاں نہ تھا کہ ستر برس کی عمر میں بھی تیر کی طرح سیدھا رہتا۔ پھر یہ بھی ہے۔" ایک دوسرے ممبر نے مصرع اٹھایا۔" کہ شاعر جتنا غلط بنے اتنا ہی صحیح بنتا ہے۔" فکر کا بات نہیں۔" مس شیپ شیٹنگ کرنل فرودی کے اعتراض کو سمجھتے ہوئے بولیں۔" عرفی کا ڈاڑھی ہم شائستہ خاں کو لگا دے گا۔"

"ہاں! یہ ٹھیک رہے گا۔" کرنل صاحب نے اطمینان کا سانس لیا۔" شائستہ خان کا اس میں بگڑتا ہی کیا ہے۔ مگر عرفی کے معاملہ میں تاریخ کی صداقت مسخ ہوتی ہے۔ بھئی میں طہران کی نیشنل گیلری میں عرفی کی تصویر دیکھ چکا ہوں۔ کرنل صاحب بات کرتے کرتے

اسٹیج پر چلے گئے اور عرفی بنے ہوئے کیپٹن خواجہ امین کو غالباً پہچان کر افسرانہ تحکم کے ساتھ بولے "عرفی داڑھی کے بغیر ہوگا اور آدمیوں کی طرح سیدھا چلے گا "اٹن شن !" ——— اور بیچارہ عرفی ایڑی سے ایڑی ملاکر اٹن شن کھڑا ہوگیا۔ مس شیپ شینک عرفی کی لمبی سفید داڑھی نوچ کر شائستہ خان کے لگا رہی تھیں کہ گروپ کے "ابن بطوطہ" شیخ مصباح الدین، مولوی عبدالحلیم شرر کا کوئی ناول بغل میں دبائے اندر داخل ہوتے اور بوڑھے شائستہ خان کو دیکھتے ہی تڑپ اٹھے۔ پہلے زور سے ایک نعرۂ تکبیر بلند کیا، پھر گرج کر بولے:

"خبردار! شائستہ خان کے ساتھ یہ ناشائستگی؟ فاتح گولکنڈہ کے ساتھ یہ مذاق؟ غازی شائستہ خان وہ بطل جلیل اور مجاہد کبیر تھا کہ مغل اعظم محی الدین اورنگ زیب عالمگیر بھی اس کی تلوار کی قسم کھاتا تھا"

اس بھبکی پر سہم کر جب لوگ قدرے سنبھلے تو کسی نے ڈرتے ڈرتے کہا:

"مگر میاں صاحب! شائستہ خان بوڑھا بھی تو ہوسکتا ہے"

"نہیں ہرگز نہیں" میاں مصباح الدین کڑک کر بولے "مردان غازی مر سکتے ہیں بوڑھے نہیں ہوسکتے"

"کیوں نہیں ہوسکتے؟"

"بس نہیں ہوسکتے، کہہ تو دیا"

اس پر مس شیپ شینک نے شائستہ خان کی داڑھی جڑ سے اکھاڑ کر جہانگیر کے خزانچی لالہ نوبت رائے کی ٹھوڑی پر جمادی۔ یہ جھگڑا پوری طرح طے نہیں ہوا تھا کہ کرنل فردوسی نے پائپ سلگاتے ہوئے ایک نیا شگوفہ یہ چھوڑ دیا کہ عرفی اور طالب آملی دونوں بیک وقت

جہانگیر کے دربار میں کبھی یکجا نہیں رہے۔ ان کے علم کے مطابق دونوں شاعروں میں سے کوئی ایک جہانگیر کے عالم شہزادگی ہی میں مر چکا تھا۔ اب یہاں عرفی وطالب کو یکجا دیکھ کر کرنل صاحب کی خفگی کا یہ عالم تھا کہ اگر انہیں اجازت دی جاتی تو وہ عرفی وطالب میں سے کسی ایک کو اسی وقت گولی سے اڑا دیتے۔ بذات خود یہ کوئی ناقابل حل دشواری نہ تھی۔ مس شیپ شینک نے نہایت ٹھیک کہا تھا کہ عرفی وطالب دونوں کے نہ ہونے سے جہانگیر کی حکومت پر کوئی اثر نہیں پڑتا لیکن اگر شاعر دربار کے بغیر دربار جچتا ہی نہیں، تو قرعہ اندازی کر لو مگر اتنے میں ادھر عرفی اور طالب کے حامیوں کے جذبات اس قدر مشتعل ہو چکے تھے کہ اب یہ سوال عرفی وطالب میں سے کسی ایک شاعر کے انتخاب کا سوال یا ڈرامے کی کسی انتظامی سہولت یا ضرورت کا معاملہ نہیں رہ گیا تھا۔ بلکہ مغلوں کی پوری تہذیب وثقافت کا مسئلہ بن چکا تھا۔ رفتہ رفتہ فریقین کے جذبات اتنے کھول اٹھے کہ خود "ظل ہمایونی عالم پناہ شہنشاہ جہانگیر" یعنی مسٹر الطاف حسین لودھی تاج سلطانی اور چغہ خسروی کو ایک طرف ٹپک کر اس بحث میں کود گئے جس کا خلاصہ یہ نکلا کہ اس صحبت میں ڈرامہ کھیلنے کا فیصلہ ہی ترک کر دیا گیا۔

ڈرامہ کی ناکامی کا ہمارے گروپ پر نہایت گہرا اثر پڑا۔ ناکامی کی تمام تر ذمہ داری اگرچہ خود ہمیں پر عائد ہوتی تھی مگر چونکہ اپنے آپ کو مطعون کرنے کی بہ نسبت دوسروں کو الزام دینا ہمیشہ آسان ہوتا ہے۔ لہذا ہم لوگ کلب سے بیزار ہو گئے۔ اس واقعہ کے بعد ہم اس قطعی نتیجہ پر پہنچ گئے کہ غلامی کے زمانہ میں اندر ہی اندر ہماری قوم کے صاف دو ٹکڑے ہو چکے ہیں۔ ایک یہ لوگ جو کلبوں اور جم خانوں میں پروان چڑھتے رہے۔ ایک ہم لوگ، جو گلیوں اور کوچوں میں گھومتے پھرے، صدیوں کے بعد دونوں ٹکڑے اب اس

کلب میں جو ٹرے جا رہے تھے مگر اے کاش ذہنوں کی مسافت میلوں میں ناپی جا سکتی! استاد عرفی اور طالب آملی میں سے کوئی ایک یقیناً بہت پہلے مر چکا تھا۔

بڑے کلب سے نکل کر گروپ نے ایک نئے کلب کی بنیاد رکھ دی ”آزاد کلب“ آرزو یہ تھی کہ نئے کلب میں اپنے قومی و تہذیبی نقوش کو زیادہ سے زیادہ اجاگر کیا جائے مساوات و آزادی اس کلب کے بنیادی پتھر تھے۔ مگر چونکہ اس سے پہلے گروپ کو کسی چیز کی بنیاد آزادی سے زیادہ بے قاعدگی پر جا پڑی۔ آزاد کلب کی رکنیت اور یتیم خانہ ترجمان الاسلام کی رکنیت میں کوئی فرق نہ تھا ظاہر ہے اس قسم کا کلب یا چلنے میں نہیں آتا یا تھمنے میں نہیں آتا۔

کلب کا پورا ڈھانچہ امداد باہمی کے اصولوں پر کھڑا کیا گیا۔ ممبروں کو چندہ ادا کرنے سے پہلے اپنے حصہ کی کرسی ”ادا“ کرنا پڑتی تھی بلکہ ایک مدت تک تو کرسی کے علاوہ کسی نوع کا کوئی چندہ تھا ہی نہیں۔ کلب کی اپنی عمارت ہونے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا ہم سے پہلے کئی کلبوں کا حشر دیکھ چکے تھے کہ جب ان کی اپنی عمارت بن گئی تو خود کلب ٹوٹ گئے۔ یوں بھی آزاد کلب کو کسی مقام کا پابند کر دینا چہ معنی وارد۔ چنانچہ ابتدا میں کلب کو کبھی شہر کے ایک اسکول میں رکھا گیا، کبھی دوسرے میں۔ جب تقریباً تمام اساتذہ اور طلباؔ سے کلب کے شاعروں، فنکاروں کے تعلقات کشیدہ ہو گئے تو آزاد کلب کو ایک افغان ہوٹل سے ملحق سفید زمین کے ایک کشادہ قطعہ میں لا کر اس طرح چھوڑ دیا گیا کہ

پڑیئے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار
اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

اتفاق دیکھیے کہ کلب کی جڑیں اسی زمین میں سر سبز ہوئیں، قبولیت کا وہ دور

یہیں آ کر شروع ہوا جو شروع ہو کر پھر تھمنے میں نہیں آتا۔ چائے، قہوہ، شربت وغیرہ طلب کرنے پر افغان ہوٹل سے نقد و ادھار آجاتے تھے۔ مگر یہاں افغان ہوٹل کا زندہ دل اور شاعر مزاج مالک رانجھا خان رانجھارات کو سمیٹ کر ہوٹل میں رکھ دیتا تھا۔ کھیل کود سے ممبروں کو کوئی خاص رغبت نہ تھی۔ وہ یہاں محض بیٹھنے اور خالص گپ لڑانے کیلئے آتے تھے۔ تاہم بیٹھ کر کھیلے جا سکنے والے بعض معروف کھیلوں کا اہتمام بھی موجود تھا۔ افغان ہوٹل کا مستعد ریڈیو ہوٹل کے گاہکوں، سڑک کے راہگیروں اور آزاد کلب کے ممبروں کی خدمت میں ہمہ وقت مصروف تھا —— اور کیا چاہتا ہے دیوانے!

رکنیت پر کوئی خاص قید نہ تھی، صلائے عام تھی یاران نکتہ دان کے لئے۔ چند دنوں میں آزاد کلب کی جغرافیائی اور معنوی سرحدیں افغان ہوٹل سے جا ملیں۔ ع

بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے

بذات خود یہ بری بات نہ تھی مگر سرزد ایسے برے طریقے سے ہوئی کہ دیکھنے والے تو دیکھنے والے خود ممبروں کو معلوم نہ ہو سکتا تھا کہ یہ آزاد کلب چل رہا ہے یا افغان ہوٹل۔ بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک نہیں ہوئے تھے، باہم گتھم گتھا ہو گئے تھے۔ شاعروں کی منڈلی کسی میز پر تقی میر کو لئے بیٹھی ہے کہ گھی کے کسی موٹے تازے بیوپاری نے اپنا گھی کا کنستر لا کر عین میر تقی میر کے سر پر رکھ دیا۔ شعراء کو گھی سے، گھی والے کو میر تقی میر سے کوئی واسطہ نہیں مگر کلب سے دونوں کا واسطہ ہے۔ شامت کا مارا کوئی افسر اپنے ادب و تمدن کے عشق میں گرفتار آزاد کلب میں آنکلتا تو راشن کے ڈپو ہولڈروں، عام دکانداروں اور شہر کے پیشہ ور خوش آمدیوں کا ایک ہجوم اس غریب کو یوں گھیر لیتا جیسے بچوں کی

کسی بستی میں کوئی پوچھنے والا آنکلا ہو۔

یہ بات نہ تھی کہ جو آزاد کلب شہر کے معززین کی سرپرستی سے یکسر محروم تھا۔ ہاں یہ بات ضرور تھی کہ شرفاء ہمارے حصے میں آتے تھے۔ ان میں سے بیشتر کچھ اس سرحد پر کھڑے تھے جہاں دولت و شرافت کے راستے الگ ہو جاتے ہیں اور ذہن تفکر کی بالیدگی راستہ ہی چھوڑ دیتی ہے۔ ان میں سے بعض رئیس زادوں کی قسمت پر اوّل اوّل ہمیں بڑا تاؤ آتا کہ دیکھو منہ میں چاندی کا چمچہ لے کر پیدا ہو گئے ہیں اور بیٹھے کیا مزے کر رہے ہیں۔ قریب سے دیکھا تو محسوس ہوا کہ ان سے زیادہ قابلِ رحم حالت شاید کسی کی نہ ہو۔ انہیں سرے سے یہی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ زندگی کے بے معنی خلا کو پورا کیونکر کیا جائے؟ جو قدرے ہوشمند تھے انہوں نے سیاست کا چسکا پال رکھا تھا۔ بعض عالی ظرف انتخابات کے معرکے جیتنے کے لئے نہیں ہارنے کے لئے لڑتے تھے وزارت بڑے کلب میں تھی، جمہوریت آزاد کلب میں۔ جلسہ کہیں بھی ہو نعرے کی گونج یہیں سے پھوٹتی ہے۔

ہمارا گروپ اس صورت حال پر سخت پریشان تھا، ہم جس مقام کو ایک مجلسی و تہذیبی مرکز بنانے کے خواب دیکھ رہے تھے وہ کہیں جمعدار گھسیٹے کی بیٹھک بن گیا تھا اور کہیں راجہ بازار۔ رؤسا بیٹھے حقہ پی رہے ہیں۔ چمڑے ہڈی وغیرہ کے تاجر مول تول کر رہے ہیں۔ نمک، ہلدی کے بیوپاری، نمک ہلدی کے نمونے بھی ساتھ اٹھا لاتے ہیں، لباس، وضع قطع، تہذیب وغیرہ سب کا دامن تار تار ہو کر کلب میں بکھر اپڑا تھا اردو شاعری میں جس چاک گریبان کا ذکر آیا ہے اس کی بھی ایک صورت ہوتی ہے۔ یہاں وہ صورت بھی نہ تھی۔ آزاد کلب میں لیڈری کی جا سکتی تھی، بازار سے سودا سلف خریدا

جا سکتا تھا، لیکن نکھری ہوئی مجلسی زندگی کے ملنے کا کوئی امکان نہ تھا، زندگی خود زندگی میں گھٹ کر رہ گئی تھی۔

سب سے برا حال شعراء کرام کا تھا۔ شعر سے زیادہ ان کا اپنا قافیہ تنگ تھا غزل پر غزل ہو رہی ہے مگر کلب میں سننے والا کوئی نہیں، سن کر سمجھنے والا کوئی نہیں، سمجھ کر داد دینے والا کوئی نہیں۔ الگ تھلگ ہو کر شعر بازی کرتے ہیں تو دوسرے لوگ کلب کے اس بیجا۔ غلط استعمال پر معترض ہوتے ہیں، بعض برملا ہنستے بھی ہیں۔ ادھر یہ آرزو کہ شام کو "مطلع" شروع ہو تو "مقطع" صبح کی خبر لائے۔ ادھر یہ قصد کہ غزل کا سانس مطلع میں گھونٹ دیا جائے۔ وہاں نمونہ کلام سے زیادہ نمونہ اجناس کی مانگ تھی۔

لپٹن کمپنی والے ایک زمانہ میں اپنے برانڈ کے فروغ کے لئے لوگوں کو مفت چائے پلایا کرتے تھے۔ آزاد کلب میں ذوق سخن کا راستہ صاف کرنے کی غرض سے ہم نے ایک مشاعرے کا بندوبست کیا جو بدقسمتی سے بڑے کلب کے ڈرامے سے بھی زیادہ ناکام رہا۔ جوش و خروش کی کمی نہ تھی۔ جوش و خروش اگر کم ہوتا تو مشاعرہ شاید کامیاب ہو جاتا۔ کلب کے عام ممبروں نے مشاعرہ کو کسی میلے پر ہونے والا مجرا یا اس کے لگ بھگ کوئی تماشہ سمجھ لیا۔ وہ نہ صرف خود جوق در جوق تشریف لائے۔ بلکہ محلے میں سے دوستوں، رشتہ داروں کو بھی فوج در فوج پکڑ لائے، یہ بظاہر حوصلہ افزا علامت تھی مگر دراصل یہ اس قسم کی تعمیر تھی جس میں خرابی کی صورت مضمر ہوتی ہے۔ جمہوریت کی طرح مشاعرہ بھی ان پڑھ لوگوں کے بس کی چیز نہیں۔ آپ مبالغہ سمجھیں گے مگر میں واقعہ بیان کر رہا ہوں کہ جس وقت سیکرٹری نے مشاعرہ کی کاروائی

شروع کرنے کی غرض سے مشاعرہ گاہ پر جائزہ لینے والی ایک نظر ڈالی تو سرسری اندازے کے مطابق سامعین اور سامعین کے حلقوں کی تعداد تقریباً برابر تھی۔ شعراء کی گنتی بھی اگرچہ بہت کافی تھی لیکن ان بٹیروں سے کم ہی تھی۔ جنگجو بٹیر بازی کے دلدادہ معززین مٹھی میں دبائے ہوئے مشاعرہ سننے چلے آئے تھے۔ شعراء ان سامعین کو دیکھ کر ہی لرز اٹھے لیکن حضرت داغ کی پیروی میں جہاں بیٹھ گئے بیٹھ گئے۔ یہاں تک پھر بھی غنیمت تھا۔ زیادہ سے زیادہ یہی احتمال تھا کہ سامعین ڈھنگ کی داد نہیں دیں گے مگر کم از کم یہ اطمینان تو تھا کہ وہ کلام میں سے نشتر گربہ وغیرہ بھی نہیں پکڑ سکیں گے۔ لیکن مشاعرہ شروع ہونے پر خدا معلوم سامعین پہلے شاعر کے کلام یا اس کی صورت پر ہی اس طرح بھڑک اٹھے کہ آزاد کلب کا سارا میدان قہقہوں کے شور سے گونج اٹھا۔ ان قہقہوں میں تمسخر یا استہزا یا تذلیل کا جذبہ یا ارادہ شامل نہ تھا۔ ان کی خصوصیت وہ بے ساختہ و بے قابو مسرت تھی جو ناگہانی و بے اندازہ حیرت سے پیدا ہوتی ہے۔ انہیں یہ سمجھ ہی نہیں کہ رہا تھا کہ شعر سننے کے بعد وہ کریں تو کیا کریں شعر سن کر اگر وہ قہقہہ بھی نہ لگاتے تو میرے اندازے کے مطابق وہ اپنے دل میں سخت شرمندہ یا پشیمان ہوتے چنانچہ تین چار شعراء گزر جانے کے بعد جب لوگ سمجھ گئے کہ مشاعرہ یہی کچھ ہوتا ہے تو اکثر معززین شاعر سے زیادہ بٹیر کی طرف متوجہ ہو گئے۔

مشاعر نو خیز شعراء کی سخت جانی کے طفیل جوں توں کر کے ختم ہو گیا۔ لیکن اس دن سے ہم لوگ برابر اس فکر میں غلطاں ہیں کہ اس کلب کو توڑا کیسے جائے۔ آزاد کلب کچھ اس وارفتگی سے چل پڑا ہے کہ تھمنے میں نہیں آتا۔

☆

دیوان صاحب

ہمارے شعبہ کے نئے افسر اعلیٰ دیوان صاحب کا آج دفتر میں پہلا دن تھا وضع قطع تراش خراش، لباس وغیرہ اس لحاظ سے وہ اعلیٰ درجے کے انگریز معلوم ہوتے تھے۔ البتہ ایک کان میں مہاراجہ گائیکواڑ کی طرح ایک چمکتا ہوا ہیرا ٹمکا تھا۔ آنکھیں خوبصورت اور بڑی بڑی تھیں مگر کچھ خالی خالی، کچھ حیران حیران، جیسے آدمی بیٹھا کہیں ہو، دیکھ کہیں رہا ہو۔ جیسے دیکھتے ہوئے بھی کچھ نہ دیکھتا ہو۔

سیکرٹری والی گھنٹی بجی تو میں حاضر ہوا:

"آپ کون ہیں؟"

"جناب میں آپ کا سیکرٹری ہوں۔"

"تو آپ سیکرٹری ہیں؟"

"جناب۔"

"تو آپ سیکرٹری ہیں۔" دیوان صاحب نے پھر وہی جملہ دہرایا۔ مجھے سر

سے لے کر پیر تک ایک تفصیلی نظر سے دیکھا —— خیر! تو ٹھیک ہے مگر ایک بات آپ سن لیں کہ میرے ساتھ کام کرنا ایک مشکل کام ہے۔"

"جناب! آپ ایسے خاندانی افسر کے ماتحت کام کرنا تو میری خوش نصیبی ہے!"

"آپ ایسا سمجھتے ہیں تو شکریہ۔ وہ اٹھ کر ٹہلنے لگے۔" لیکن آپ مجھے عام آدمیوں سے بہت مختلف پائیں گے۔"

"جی"

"آپ کو میری طبیعت کو اچھی طرح سمجھنا ہو گا۔"

"جی! ہم تنخواہ ہی اس بات کی پاتے ہیں۔"

"سنئے! جب میں بول رہا ہوں تو میں دوسرے کا بولنا پسند نہیں کرتا۔"

"چھٹی آپ اس روز جا سکیں گے جس روز ہم چھٹی پر ہوں گے، دفتر کی ساری مخلوق سے واسطہ رکھنا ہمیں پسند نہیں۔"

"بہت بہتر!" مجھے خفیف سی کھانسی آ گئی۔

"میں لوگوں کے اس طرح کھانسنے کو سخت ناپسند کرتا ہوں اور دیکھئے آپ کو زکام بھی کبھی نہ ہونا چاہئیے۔"

"بہت بہتر!"

"ہم صفائی، شائستگی، باقاعدگی اور خوش ذوقی کا اعلیٰ معیار چاہتے ہیں۔"

"جی"

"پھر سنئیے، صفائی! شائستگی! خوش ذوقی! —— آپ نے بکنگھم پیلس تو دیکھا ہو گا۔"

"جی۔ بس تصویریں ہی دیکھی ہیں۔"

"تو آپ انگلستان نہیں گئے۔"

"جی نہیں"

"اٹلی یا جرمنی۔"

"جی میں تو اسلامیہ کالج میں پڑھتا رہا ہوں۔ وہاں سے سیدھا اس دفتر میں آگیا۔"

"اوہو! یہ تو بڑی کمی ہے۔ حیرت ہے کہ آپ تیس برس سے اس ایک ملک میں پڑے ہیں میں نہیں سمجھتا کہ ہماری طبیعت کو سمجھ سکیں گے؟"

"جناب میں کوشش کروں گا کہ جناب کو مطمئن کروں۔"

"بہر حال صفائی اور باقاعدگی ——— دیوان صاحب ٹہلتے ہوئے دروازے کے پاس جا کھڑے ہوئے اور پردے کو گھورنے لگے ——— "ادھر تو آیئے۔"

"جی"

"ہم تو اس دفتر میں بیٹھ ہی نہیں سکتے۔"

"ہم تو پاگل ہو جائیں گے۔"

دیوان صاحب واقعی پاگلوں کی طرح اچھلنے لگے۔ پردے کے ایک مقام پر انگلی رکھ کر بولے۔

"یہ کیا ہے؟"

"پردہ ہے جناب"

"یہ پردہ ہے؟" دیوان صاحب نے ایک ذرا ابھرے ہوتے دھاگے میں انگلی

ڈالی اور ایک ہی جھٹکے میں تین چار گز دھاگہ گھسیٹ کر باہر نکال لائے۔

"یہ پردہ ہے۔"

دیوان صاحب اب واضح طور پر جنوں کی ایک کیفیت میں داخل ہو چکے تھے وہ چلا کر کہتے ——— یہ پردہ ہے؟ ——— اور اچھل کر کچھ دھاگہ گھسیٹ کر فرش پر ڈھیر کر دیتے، یہاں تک کہ تمام پردہ تار تار ہو کر زمین پر آ رہا ———

"یہ پردہ ہے؟" دیوان صاحب ہانپ رہے تھے۔

"جناب مجھے افسوس ہے آپ کو اتنی کوفت ہوئی۔"

"کوفت؟ یہ تکدر تو اب مہینوں چلے گی۔"

"جی واقعی میں نادم ہوں۔"

"نہیں تمہارا کوئی قصور نہیں ——— دیوان صاحب کرسی میں جا بیٹھے۔" تمہارا کیا قصور ہے۔" وہ جیسے کسی سوچ میں کھو گئے۔ تمہارا کیا قصور ہے۔" آج کی پوری دنیا ہی ایک ایسا پردہ ہے جس کے سب دھاگے نکلے ہوئے ہیں۔" اور وہ سوچ کے ایک طویل غوطے میں ڈوب گئے۔ تنگ آ کر میں نے پوچھا۔

"جناب میرے لئے کیا حکم ہے؟"

"کچھ نہیں۔ تم جا سکتے ہو۔" وہ بظاہر نارمل ہو گئے تھے۔" ایسے موقعوں پر آپ ہمیشہ چپ چاپ چلے جایا کریں!

میں چپ چاپ جانے لگا تو بولے۔

"ٹھہریئے! میں آج تمام سٹاف کو ایڈریس کرنا چاہتا ہوں۔ تین بجے!"

"بہت بہتر جناب!"

عام طور پر ہر نئے افسر کی شہرت اس کی آمد سے پہلے ہی دفتر میں پہنچ جاتی ہے۔ دیوان صاحب کی شہرت خاصی تشویش انگیز تھی —— بیان کیا گیا تھا کہ وہ ایک بہت بڑے جاگیر دار کے فرزند ہیں۔ پورے تیس برس یورپ کی آٹھ دس مختلف یونیورسٹیوں میں فلسفہ پڑھتے رہے ہیں۔ جب تک فیل ہوتے رہے۔ مسلسل شادیاں کرتے رہے۔ پاس ہونے لگے تو بیویوں کو طلاق دیتے گئے۔ چنانچہ فلسفے اور طلاق کی بہت سی ڈگریاں ان کے پاس ہیں۔ یہ تو خیر ذاتی سی باتیں تھیں اگرچہ دفتر کے کہنہ مشق سپرنٹنڈنٹ مولوی نوشاد علی کی رائے میں یہ باتیں بھی کچھ اہم نہ تھیں۔ بہر حال تشویش کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ان کی طبیعت میں نفاست اور فلسفہ کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ ان کی ذات میں یہ دونوں چیزیں اس حد کو پہنچ گئی تھیں کہ ان کی ذات سرے سے گویا موجود ہی نہ تھی نفاست کے ہاتھوں وہ زندگی بھر کوئی کام نہ کر سکے اور فلسفے کے ہاتھوں دو مرتبہ پاگل ہو چکے تھے۔ اس کے علاوہ وہ اپنے آپ کو ذہنی طور سے اتنا بڑا آدمی سمجھتے تھے کہ دنیا کا ہر کام ان کے لئے چھوٹا ہو کر رہ گیا تھا۔ موجود منصب اگرچہ بہت بڑا تھا مگر لوگ حیران تھے کہ انہوں نے اس منصب کو قبول کیسے کر لیا۔ لوگ یوں بھی حیران تھے کہ فولاد سازی کے کارخانے میں ایک فلسفی رئیس زادے کو لا بٹھانے میں آخر کیا تُک تھی مگر خیر یہ تو رسوخ کی بات تھی اور ہمارے کارخانے میں رسوخ اتنا چلتا تھا کہ کارخانہ تقریباً بند ہی پڑا رہتا۔

دیوان صاحب جب تشریف نہیں لائے تھے ہم لوگ سوچتے کہ یہ افواہیں غلط ہوں گی۔ یار لوگ بڑھا بھی دیتے ہیں کچھ زیب داستان کے لئے۔ لیکن آج پہلے ہی سابقے نے واضح کر دیا کہ ان کے بارے میں غلط سے غلط بات بھی درست تھی بلکہ بعض معرکے

کی، غلط باتوں کا، تو ہمیں ابھی علم ہی نہ تھا۔

"تین بجے دوسرا سانحہ پیش آگیا۔ آپ لیکچر دینے آئے تو لیکچر نہ دے سکے۔ چشمہ جیب سے نکالا، چڑھایا، اتارا، گھمایا! تین مرتبہ یہی عمل کیا۔ تین چار زاویوں سے لوگوں کو دیکھا اور پھر جیسے ایک دم گھبرا گئے۔ ماتھے پر پسینے کی بوندیں ابھر آئیں اور تیر کی طرح کانفرنس روم سے نکل گئے۔ جاتے جاتے مجھ سے کہہ گئے:

"یہ تو ناقابل برداشت ہے۔ آپ آیئے!"

دفتر میں فرمایا:

"وہ لمبی داڑھی والا آدمی کون تھا۔"

"وہ جو پہلی قطار میں کرسی پر بیٹھے تھے؟"

"کرسی ورسی تو وہاں کہاں تھی، داڑھی ہی داڑھی تھی، مگر وہاں وہی۔"

"جناب وہ ہمارے دفتر کے سینئر سپرنٹنڈنٹ مولوی نوشاد علی ہیں۔"

"تو گویا داڑھی بھی سینیارٹی کے حساب ہی سے چھوڑ رکھی ہے۔"

"جناب مذہبی شعائر و احساسات کے بارے میں....."

"اوہو ہم سمجھ گئے ــــ مگر ان کی ناک بھی تو بڑی واہیات ہے۔"

میں ہنس پڑا۔

"تم ہنس رہے ہو؟"

"؟"

"یہ رونے کا مقام ہے ــــ ناک ہی سے قوموں کی فراست اور عظمت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔"

"جی"

"یہ فلسفے کا ایک طے شدہ اصول ہے کیا آپ نے فلسفہ پڑھا ہے؟"

"جی"

"تاریخ؟"

"میں نے تاریخ ہی میں ایم۔اے کیا ہے۔"

"گویا تاریخ بھی نہیں پڑھی۔ ایم اے تک تاریخ نہیں، تاریخ کا کیلنڈر پڑھایا جاتا ہے۔ میں فلسفہ تاریخ کی بات کر رہا ہوں، جو بہت بعد کی چیز ہے بلکہ خود انسان کے اندر کی چیز ہے۔"

"جی"

"بہرحال ناک انسانی کردار کا بنیادی پتھر ہے"

"!"

"سیدھی ناک والی قومیں ہمیشہ فاتح ہوتی ہیں"

"جی"

"اور اوپر کو اٹھی ہوئی ناک والی قومیں ہمیشہ اوپر کو جاتی ہیں"

"بجا"

"چپٹی ناک بھی بری نہیں ہوتی۔ بلکہ جب تک ایک حد میں رہتی ہے۔ تفکر پیدا کرتی ہے۔"

"جیسے چینیوں کی ناک"

"بالکل" میرا عقیدہ ہے کہ اگر کنفیوشش چین میں نہ پیدا ہوتا تو شاید پیدا

ہی نہ ہوتا ــــــ آج کل ان کی ناک کچھ زیادہ پھیل گئی ہے تاہم وہ بھی پھیل ہی رہے ہیں، تم دیکھ لو!

"درست ارشاد فرمایا"

"مگر یہ نیچے کی طرف کو مڑی ہوئی ناک پھوہڑپن کا سمبل ہے ــــــ تم ان مولوی صاحب سے کہہ دو کہ اپنی ناک سیدھی کر لیں۔"

"ناک سیدھی کر لیں؟" میں نے اپنی ناک پر رومال پھیرتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں ہاں بھئی ناک ــــــ سیدھی ــــــ بالکل سکندر یونان کی طرح ــــــ یا بے شک کچھ اوپر کو اٹھا لیں۔"

"حضور ناک کو....."

"یا تھوڑی سی چوڑی کر لیں۔"

"جی! جی!"

"کچھ کر لیں ــــــ مگر یہ قوس بنائی ہوئی اور گھوم پھر کر منہ میں داخل ہوتی ہوئی ناک ــــــ لاحول ولاقوۃ ــــــ سخت ناقابل برداشت چیز ہے۔"

"جی"

یہ ناک نہیں دونالی بندوق ہے ــــــ آدمی ہی کے لئے نہیں آدمیت کے لئے بھی!

"!"

"تم نے دیکھا نہیں کہ میں اس نامعقول چیز کو دیکھ کر بول ہی نہ سکا ــــــ حالانکہ مجھے بہت کچھ کہنا تھا ــــــ کل ہم سٹاف کو پھر ایڈریس کریں گے۔"

"مگر حضور....."

"مگر وگر کچھ نہیں۔ لوگوں سے کہہ دو کہ ناک درست کر کے آئیں ـــــ ہم اونچی اور سیدھی ناک مانگتے ہیں ایک سرے سے دوسرے سرے تک ـــــ سمجھ گئے"!

"لیکن جناب ـــــ ہمارے دفتر میں تو میرا مطلب ہے کہ بدقسمتی سے بہت سی ناکیں....."

"یعنی نیچے کو جھکی ہوئی ہیں"

"کچھ ایسا ہی اتفاق ہے جناب"

"اور گھومتی ہوئی بھی؟"

"جی جی! کچھ ایسی ہی"

"اور قوس بنا کر منہ میں داخل ہوتی ہوئیں؟"

"جی جناب"

"خاموش! ـــــ دیوان صاحب یکبارگی گرج اٹھے ـــــ ہم یہ سب کچھ نہیں سن سکتے! ـــــ چلے جاؤ یہاں سے! ـــــ ہم پاگل ہو جائیں گے! ـــــ

اور وہ صبح کی طرح سوچ کے ایک گہرے طویل غوطے میں ڈوب گئے۔

سٹاف کو جب یہ ماجرا معلوک ہوا تو لوگ ناک پکڑ کر بیٹھ گئے ـــــ گنتی کی چند ناکیں سیدھی ہوں تو ہوں ورنہ ہر ایک ناک میں کوئی نہ کوئی نقص ضرور تھا۔ ہر شخص کو ڈر تھا کہ ناک رکھتے ہیں تو ملازمت جاتی ہے لیکن قدرت کو لوگوں کی آزمائش شاید منظور نہ تھی۔ دوسرے دن دفتر میں آنے کے بجائے دیوان صاحب نے اپنا استعفیٰ دفتر میں بھیج دیا جس میں لکھا تھا:

"فولاد کے ستون بنانے سے پہلے لوگوں کی ناک بناؤ!"

ڈائری کا خیالی پلاؤ

۱۰ر جون — کیمپ میں پہلا دن!

دوپہر کو دفتر سے خیمے میں آیا تو اندر دو گلہریاں ناچ رہی تھیں - ایک گلہری — پانی سے بھرے ہوتے ٹب کے ساحل پر ادھر سے اُدھر، اُدھر سے اِدھر، چہل قدمی کر رہی تھی، ٹب، میرے "کیمپ کارٹ" کی پٹی کے ساتھ پٹی لگائے اس قرینے سے لگا رکھا تھا کہ اگر میں غفلت سے کروٹ بدلوں تو غڑاپ سے ٹب میں جا گروں — دوسری گلہری جو پہلی کے مقابلہ میں .... زیادہ سراپا ناز تھی .... میز پر کھڑے "شیو" کے آئینے کے سامنے بیٹھی شیشے میں اپنا رخ زیبا دیکھ رہی تھی۔ منہ دیکھتی جاتی اور چیں چیں کرتی جاتی — شاید اپنے آپ پر بہ آواز بلند قربان ہوتی جا رہی تھی۔

دانہ تُو، دہقان بھی تُو کھیتی بھی تُو حاصل بھی تُو

میری آہٹ سن کر، دونوں گلہریاں کدا کڑے بھرتیں پردے کے نیچے سے، جو عقب میں غسل خانے کی چھولداری میں کھلتا ہے .... بلکہ بند ہوتا ہی نہیں باہر دوڑ گئیں اتنے میں کیمپ کا پرانا خدمت گار — کاکا چاچا — پانی کی بالٹی اٹھائے آگیا — میں نے سرزنش کے لہجے میں پوچھا:

"کاکا — خیمہ میں گلہریوں نے بڑبونگ مچا رکھی تھی؟"

کاکا — کے جواب سے معلوم ہوا کہ یہ تو ہماری اپنی گلہریاں تھیں - اپنی — "نورچشمیاں" جو ہمارے خیمے پے پیچھے جال کے "بزرگ" لٹ دھاری درخت کی

کھوہ ہیں رہتی ہیں۔ جب سے کیمپ کھلا ہے۔ روزانہ گھڑی کے مطابق ٹھیک دو بجے خیمے میں آکر ٹب سے پانی پیتی اور آئینے میں منہ دیکھتی ہیں.... یہ بھی معلوم ہوا کہ مجھ سے پہلے جو امریکن "لیزان آفیسر" اس خیمے میں رہتا تھا۔ وہ ان گلہریوں کے ذوق و شوق اور ان کی آسائش کا اتنا لحاظ رکھتا تھا کہ جب تک گلہریاں خیمے کے اندر ہوتیں، وہ خود باہر دھوپ میں کھڑا رہتا۔ وہ تو ان کے واسطے امریکہ سے جدید ساخت کا یخ دان منگوا رہا تھا۔ مگر اتنے میں خود ہی امریکہ چلا گیا... آئینِ قدرت یہی ہے... وہ "تھا" وہ "نہیں" ہے!

کاکا چاچا.... گلہری کو گلہرا کہتا ہے۔ کیونکہ اس کا اپنا گاؤں راولپنڈی کے شمال مغرب میں "گلہرا گلی" کے پہاڑی علاقے میں واقع تھا..... کاکا گلہروں کی دلاوری و مردانگی کا دل و جان سے معترف ہے کہنے لگا۔ "صاحب! بڑا بہادر گلہرا ہے۔"

"وہ کیسے؟" میں نے پوچھا۔ "صاحب! چلو ذرا باہر چل کر تو دیکھو جتنے لمبے کھوہ میں یہ رہتا ہے اس جگہ میں ریچھ اپنے بال بچہ سمیت رہ سکتا ہے؟"

یہ سن کر مجھے ہنسی آگئی۔ مزید ہنسی ایک اور سوال کے جواب پر آئی۔ "ٹب" کے بارے میں پوچھا:

"کاکا.... یہ "باتھ روم" کی چیز یہاں کیوں پڑی ہے؟"

جواب ملا... "صاحب جی! اس جگہ میں گرمی سخت پڑتا ہے۔" صاحب جی! اس دوپہر کو "ٹب" میں آرام کرتا ہے۔ چیف صاحب (بڑا انجینئر) تو "ٹب میں" بیٹھ کر کھانا کھاتا، چرٹ پیتا ہوں۔"

یہ یک بدیشی انجینئرنگ کمپنی کا... "فیلڈ کیمپ" ہے جو ایک پہاڑی کا جگر

کاٹ کر اس کا باطن ٹٹول رہی ہے۔ ایک شعبہ ایک قریبی دریا سے "پن بجلی" بنانے میں جتا ہوا ہے۔ ہم اور تین مقامی انگریزی خوان نوجوان، رابطے ترجمانی کی خدمت پر مامور ہیں۔ غیر ملکی ماہرین جس وقت "پن بجلی" کو "اُردو میں بلانا" چاہتے ہیں تو وہ ہمیں بلا لیتے ہیں کہ ع

بنتی نہیں ہے بادہ ساغر کہے بغیر

چاچا کاکا۔ سچ کہتا تھا۔ یہاں واقعی قیامت کی گرمی پڑتی ہے۔ دوپہر کو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے آپ خیمہ کے اندر بیٹھے بھی، سورج کو سامنے تاپ رہے ہیں۔ دوپہر کے بعد لوگ سگریٹ سگار، سلگا کر "ٹب" میں بیٹھ جاتے ہیں آج میں "ٹب" میں بیٹھا ... شفیق الرحمٰن کی حماقتیں" پڑھتا رہا۔ کچھ عجیب دلنواز عنابی، گلابی سا مزاح لکھتا ہے ع

خود بخود دل میں ہے اک شخص سمایا جاتا

خیمے کے بالکل سامنے تربوزوں کا کھیت ہے۔ عصر کے بعد کچھ وقت کھیت میں ٹہلتا رہا۔ تربوزے سے تربوز کندھا ملائے بیٹھا ہے۔ چند تربوزوں کے گنبد اتنے اونچے چلے گئے ہیں کہ وہ جملہ تربوزوں کے لیڈر معلوم ہوتے ہیں۔ میں ایک لیڈر کی پشت پر بیٹھ کر یہ دیکھتا رہا کہ ایک تربوز دوسرے کو دیکھ کر رنگ کیسے پکڑتا ہے؟ کچھ نظر نہ آیا تربوز کو دیکھ کر تربوز موٹے ضرور ہو رہے تھے۔

یہ کبوتران عقابی

یہ کیمپ ——— برطانیہ کی طرح ——— اپنی ذات میں تو بڑا نہیں ہے۔ ہاں پھیلا ہوا بہت ہے۔ آبادی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بکھری ہوئی ہے۔ ایک کا دھواں دوسرے تک نہیں پہنچتا۔ کسے راہ با کسے کارے نہ باشد۔ کچھ بلندی پر افسروں کے خیمے ———

درجہ بدرجہ نشیب میں ماتحت عملہ اور مزدوروں کی بارکیں، جھونپڑے، جیسے زمین ہی میں سے اُگے ہوئے ہوں۔ ایک بازو پر کھیت ہی کھیت آج کل کی کڑی دھوپ جب کوئی کسان کھیت میں ہل چلاتا نظر آتا ہے تو دل چاہتا ہے کہ دنیا کے ہر پیشے کو اٹھا کر اس کے گرد آلود قدموں پر ڈال دوں۔ مجھے تو کاشتکار سے بڑھ کر آزاد کوئی دوسرا فرد دنیا میں نظر نہیں آتا۔

لنچ پر آج تربوز کے سرخ سرخ قتلے بھی تھے میں بھاگا بھاگا۔ کھیت میں پہنچا مبادا "بڑا تربوز" مارا گیا ہو — لیڈر سلامت تھا۔ وہ چار چھوٹے چھوٹے تربوز مارے گئے — ہائے یہ چھوٹی مچھلیاں؟

۱۴ر جون

پچھلے دو تین دن ڈائری نہ لکھ سکا۔ پرسوں شام آندھی چلی تو کیمپ کی ایک ایک چیز پکارنے لگی — لینا کہ چلی ہیں! — میرے پیٹرولیمپ کی چمنی ٹوٹ گئی اور کیمپ میں — شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں — کاکا چاچا — کہیں سے ایک مری ہوئی لالٹین جس کی روشنی ایک آدھ پروانے کے لئے بھی بمشکل نکلتی تھی لے آیا تھا۔ بارے کہ چاچا آج قصبے سے دوسری چمنی لے آیا۔ چمنی کے علاوہ آپ شوخ رنگ کی چوڑیوں کا ایک گچھا بھی ہاتھ میں تھامے ہوئے تھے۔ چاچا کی بیوی کو مرے دس برس ہو چکے تھے اس کے کوئی اولاد نہ تھی۔ جب کبھی قصبے جاتا۔ کیمپ کے دھوبی اللہ جوایا کی بیٹی کے لئے کوئی نہ کوئی چیز ضرور لے آتا — دن میں ایک مرتبہ اللہ جوایا کے ہاں ضرور جاتا۔

چاچا — دراصل کاکا کا عرف تھا۔ وہ ابھی پچاس پچپن کے پیٹے میں ہو گا۔ جسم مفلسی کی وجہ سے بجھا بجھا سہی مگر زندگی کا شعلہ تو نہیں بجھا تھا۔ دوسری شادی کا

پکا تہیہ تھا صرف اس بات کا انتظار تھا کہ پھوپھی کی لڑکی جوانی میں ذرا قدم تو رکھ لے۔ آج میں نے چاچا کو اس موضوع پر گدگداتے ہوئے پوچھا۔

چاچا ارادہ تو مضبوط ہے نا ــــ یہ نہ ہو کہ جینیاں جوانی میں قدم رکھ دے اور آپ اپنا قدم پیچھے کھینچ لیں۔

اس پر چاچا نے حکیمانہ پیرائے میں جواب دیا "صاحب! سمندر کا پانی ایک مرتبہ پی لو تو پیاس بڑھتی جاتی ہے" ــــ کاکا چاچا ــــ بچپن میں مرچنٹ نیوی کے ایک "سبرنگ" کی چاکری کرتے رہے تھے۔ اس لئے پہاڑی ہونے کے باوجود سمندری گفتگو کرتے تھے۔ ایک مرتبہ جب میں ٹب میں بیٹھا تھا۔ تو نہ جانے کس بات پر فرمایا ــــ مگر مچھ جب تک پانی کے اندر رہتا ہے۔ کوئی جانور اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا ــــ چاچا کو قدرت نے بصیرت، خوش بیانی اور عاجزی کی ایک ایسی خوبی دے رکھی تھی کہ افلاس ایسے شخص کو چھو بھی نہیں سکتا۔

سمارٹی کے ساتھ لمبی گشت رہی۔ کیمپ کو پیمانۂ امروز و فردا سے ناپ کر دیکھا یہ کیمپ ایک کوتاہ قامت سلسلہ کوہ کے دامن میں واقع ہے بعض ناگوں پر، خود سلسلہ کوہ کیمپ کے دامن میں واقع ہے ــــ ایک پہلو میں جھاڑ جھنکار کا ایک دردمند بیابان ــــ ایک طرف، ایک وادی، جس میں اگر ہم صبح اٹھیں تو باد صبح گاہی ــــ پھولوں پر شبنم کے موتی ٹکاتی نظر آتی ہے۔ ملاوٹ کے زمانے میں اتنی خالص شبنم انہی وادیوں میں میسر آسکتی ہے۔

وادی میں ہموار چلتے چلتے اچانک ایک مقام پر سلسلۂ کوہ سامنے کھڑا ہو جاتا ہے بزرگ و برتر کوہ ہمالیہ سے ان پہاڑیوں کے اتنے نیاز مندانہ تعلقات ہیں کہ ہمالیہ کی

برف پھسل کر انہی پہاڑیوں پر گرتی ہے۔ ورنہ اپنی خانہ ساز برف ان کو میسر نہیں۔

پرندوں میں اکثریت ان سادہ لوح پرندوں کی ہے جو خود اپنے پاؤں چل کر دام میں جا پھنستے ہیں ـــ سامنے ایک نامی گرامی دریا بہتا ہے۔ سامنے تو خیر نہیں ہے کہ سامنے تو پہاڑی ہے جو آدمی کو دوسری طرف کسی قیمت پر اترنے نہیں دیتی چوٹی سے دریا نظر تو آتا ہے مگر جس طرح پانی کنوئیں کی تہہ میں تارا ہو گیا۔

اس دریا کا غصہ چار دانگ عالم میں مشہور ہے پانی کا دھارا ـــ بارہ مہینے بپھرا رہتا ہے۔ چٹانوں اور بادشاہوں سے اس کو خاص پرخاش ہے۔ چٹانوں کے جگر اور بادشاہوں کے قلعے کاٹ دیتا ہے بجلی اس کے انگ انگ میں تڑپ رہی ہے مگر معلوم نہیں ـــ "مجاز لباس" میں کب نظر آئے۔

کیمپ کو پیچھے سے دیکھا جائے تو یہ ایک ترائی کے سامنے واقع ہے ـــ ترائی بھی کیا ایک چھوٹی سی "اکائی" ہے جو غالباً اشوک اعظم نے پہاڑوں کو تراش کر ایک "اسٹوپا" بنوانے کے لئے نکلوائی تھی۔ شیر شاہ سوری پہلے پیدا ہوتا تو "اسٹوپے" کی جگہ پر سڑک ہوتی۔ پھر ایک کھیتوں کا سلسلہ ہے جو ہم تک آتے آتے تربوز ہو گئے ہیں کھیتوں کا سلسلہ ہے جو ایک چراگاہ ہے جس میں دور دور کے دیہات سے گائیں چرنے آتی ہیں ـــ یاد بخیر ہمارے گاؤں کا واحد حجام ـــ بابا الف دین ـــ گاؤں کے واحد دکان دار ـــ سردار منگل سنگھ سے ٹھیک ہی کہا کرتے تھے۔

"بھائیا جی! ـــ گاؤ ماتا پوجا سے خوش نہیں ہوتی۔ اس کو چارے کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔"

اگلے روز کی آندھی میں بہت سے تربوز کھیت سے ٹوٹ کر خیمے میں آ گئے

شکر ہے نواحی چراگاہ میں صرف گائیں چرتی ہیں۔ بکریاں ہوتیں تو وہ بھی تربوز دل کے پیچھے پیچھے لڑھکتی ہوئی خیموں میں آجاتیں۔ آج تو ہم تربوز کے "مالِ غنیمت" پر خوش ہو رہے ہیں ـــــ کل اگر ہوا نے کانٹا بدلا تو ہمارے خیمے تربوز کے کھیت میں ہوں گے۔ اس خیال کے آتے ہی رگ و پے میں ایک ایسی مسکراہٹ دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی جو البیرونی کے بقول ـــــ "انسانی روح کا دروازہ کھول دیتی ہے"!

اللہ اکبر فطرت کا یہ قرب بھی کیا چیز ہے کہ آدمی مناظر قدرت کو روٹی کے لقموں کی طرح توڑ توڑ کر کھانے لگے!

۱۸ر جون

ہمارا "میس" (MESS) ایک پُر فضا مقام کے ایسے محلِ وقوع میں قائم کیا گیا ہے کہ اگر پہاڑ کی طرف دیکھیں تو ہم ترائی میں واقع ہیں اور ترائی میں دیکھیں تو پہاڑ کی کشتی پر عمارت ـــــ ٹین کے تین چار، ہم بغل و ہم عصر روغنی سائبانی کمروں پر مشتمل ہے ـــــ نہ قفس نہ آشیانہ!

لوگ سبھی اچھے ہیں۔ مہذب، شائستہ، گھاٹ گھاٹ کا پانی اور شراب پیئے ہوئے ـــــ نہ گلہ ہے دوستوں سے نہ شکایت زمانہ ـــــ جس کو دیکھو خاندان کی ڈالی سے پیدائشی ٹوٹا ہوا۔ کوئی عالم فاضل، اپنے ہنر میں بہت یکتا شخص ہے، تو وہ بھی علماء میں سے ہے جو شہزادوں کی صحبت میں اٹھ بیٹھ کر خراب ہو جاتے ہیں۔ شراب کے بغیر اہلِ فرنگ کے کام تو چل سکتے ہیں مگر ان کے کیمپ نہیں چل سکتے۔ اس کیمپ میں بھی "لال پری" کے دو چار ایسے متوالے موجود ہیں کہ جب وہ نشے میں ہوں تو ان سے عقل کی بات کرنا ایسے ہے جیسے کہ سمندر میں کسی ڈوبے ہوئے شخص کو ـــــ لالٹین

لے کر تلاش کیا جائے۔ مجھے میس میں جاتے ہوئے کچھ وحشت سی ہوتی ہے، انکل گریگوری نے جو ماحول بنا رکھا ہے۔ اس میں یوں لگتا ہے جیسے ہم لوگ پچھلی صدیوں صدیوں سے یہیں بیٹھے وہی باتیں ... وہی لطیفے دوہرائے جا رہے ہیں۔ یہاں خبریں تو آتی ہیں مگر واقعات نہیں آتے۔ فلسفے کا خمیر شاید تنہائی، تجرد اور ویرانی سے اٹھتا ہے یوں بھی۔ تنہائی میں آدمی ـــــ بعض اوقات ـــــ دوسرے درجے کی صحبت میں جا پڑتا ہے۔

۱۹ جون

اس علاقے میں جال کے درختوں نے جال بن رکھا ہے۔ یہ وہی مشہور و معروف درخت ہے جو کسی قسم کی آب و ہوا کے بغیر پھولنے پھلنے میں ید طولیٰ رکھتا ہے اپنا راستہ خود بناتا، اپنی پرورش خود کرتا ہے وسطی ایشیا کا چشم و چراغ تھا۔ وہاں سے اُگتا اُگتا یہاں تک پہنچ گیا ہے۔ روایت ہے کہ شیر شاہ سوری نے جال ہی کے تناور و سخت جان پیڑ اپنی شاہراہ کے گرد لگوائے تھے۔ چوں قبیلہ گرد ذیلی ..... کچھ عجب نہیں کہ پیڑ پہلے موجود ہوں اور سڑک بعد میں داخل کی گئی ہو جس طرح بعض شعراء ـــــ شعر پہلے کہتے ہیں اور معنی بعد میں داخل کئے جاتے ہیں ـــــ جال کے ہجوم میں خال خال بیر، شیشم و کیکر کا بھی کوئی درخت دکھائی دے جاتا ہے جیسے کہہ رہا ہو ـــــ میں خود آیا نہیں لایا گیا ہوں!

شیشم کا ایک تنہا پیڑ، تربوز کے کھیت کے حاشیے میں کھڑا رہتا ہے۔ رات جب ڈنر سے واپس آیا تو چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ دیر تک بڑے تربوز پر بیٹھا اس پیڑ کو تکتا رہا ایک عجیب ناقابل فہم سا درد فضا سے چھن رہا تھا ـــــ میرا درد؟ ـــــ چاند کا درد؟

——— شیشم کے پیڑ کا درد ——— یا اس کرسی کا درد جو ابھی درخت کے اندر جھول رہی رہی ہے۔ ع

دامن کا تار تار عیاں ہو تو بات ہو؟

۲۲ر جون

جس سے ڈرتے تھے وہی بات ہوئی ——— اگلے روز آندھی چلی تو ہمارے خیمے تربوز کے کھیت میں جا رہے۔ کیا خوب سودا نقد ہے ——— خیمے اڑے تو سامان کہاں ٹھہرتا۔ لوگ باگ کھیتوں سے اپنے تولیے، رومال، بنیان، موزے، لوٹے گلاس، تکیے وغیرہ ڈھونڈھ رہے ہیں۔ میرا دیوان حافظ" آج تک نہیں ملا ——— بلند پایہ شاعری کا شاہکار، شاید بہت ہی بلند اڑ گیا۔ میری پھندنے والی رومی ٹوپی، سامنے جالی کے درخت کی سب سے اونچی پھنگ نے پہن رکھی ہے۔ یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا ——— ہوائے دشت و کہسار کے آزاد جھونکوں میں جب اس کا پھندنا لہراتا ہے۔ جیسے پھندنا گنگنا رہا ہو ع

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا

ایک خیال آتا۔ روشنی کا مینار بن کر وہیں ٹنگی رہے۔ اشوک اس ویرانے میں اپنا ——— اسٹوپا چھوڑ گیا۔ تحفہ درویش برگ سبز۔ یوں بھی اب اس کا رنگ، میل کے باعث سُرخ سے سبز ہو چکا ہے۔ مگر پھر سوچتا ہوں کہ نہیں ——— ایسا نہیں ہو سکتا۔ یہ ٹوپی۔ والد مرحوم نے مجھے مڈل کے امتحان کے واسطے خرید کر دی تھی۔ مدتوں والد مرحوم اس کے سمیت میرے سر پر اپنا دست شفقت پھیرتے رہے۔ اب ایک مدت سے نماز پڑھنے کے کام آ رہی تھی۔ کیا عجب کہ آج اس پورے برِ اعظم میں یہ پھندنے والی آخری

رومی ٹوپی ہو۔ بقول میرے دوست نذیر احمد شیخ ؏

قدیم اتنی تو سرکار عالیہ بھی نہیں

خیر۔ فی الحال تو جہاں ہے، وہیں خوش رہے۔ کاکا کو اس وقت کیسا بانس دوں کہ وہ رات کے وقت چار چھ بانس باندھ کر ٹوپی کو درخت سے جھاڑ کر لائے۔

ٹوپی کے بجائے اگر کوئی نیولا سر پر آن گرا تو کیا ہو گا؟

انکل گریگوری آج شہر میں راشن خریدنے گئے ہوئے ہیں ورنہ وہ عجب خان کے ہاتھوں اس فاختہ کو بھی پکڑوا کر "داخل حرم" کر لیتے۔

ہیڈ کوارٹر نے کچھ دنوں سے ایک ماہر "خصوصی" معائنے کے لئے بھیج رکھا ہے کوئی ساڑھے چھ فٹ کا سہ منزلہ شخص آج رات "میس" میں ان کے اعزاز میں ایک استقبالیہ دیا گیا۔ ہلکی ہلکی چاندنی میں ہلکی ہلکی شرابوں کا دور چلتا رہا۔ جب نشہ سر سے گزرنے لگا تو ان کے ہم وطنوں نے اپنے مطالبات کی فہرست کھولنی شروع کی۔ بنیادی مطالبہ یہ تھا کہ "پینے" کا سامان تو موجود تھا۔ مگر ناچنے کے لئے "ہم رقص" نہیں ملتی!

کچھ علاج اس کا بھی اے چارہ گراں ہے کہ نہیں؟

انجینئر صاحب کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ آپ انجینئر کم تاریخ دان زیادہ ہیں جب سے آئے ہیں زیادہ وقت اس مطالعہ میں گزرتا ہے کہ ہندوستان کے قدیم حملہ آوروں کو اگر اس دریا کے پورے تاس کا نقشہ معلوم ہوتا تو آج ہندوستان کا نقشہ کیا ہوتا۔ پیسے کمپنی والوں سے لے رہے ہیں اور کام سکندر اعظم کا کر رہے ہیں۔

میری ٹوپی ہنوز درخت پر آویزاں ہے۔

۲۹ جون

—— دونوں گلہریاں اپنے وقت پر آتی جاتی ہیں۔ اب دو وقت آنے لگی ہیں۔ میں نے علامہ اقبال اور حضرت امیر خسرو کے کلام سے فال نکال کر ایک گلہری کا نام —— "شاہین کافوری" اور دوسری کا "خسرو خوباں" رکھ چھوڑا ہے "شاہین کافوری" نے جس کی طبیعت میں رستاخیزی کا پکاز زیادہ ہے، آج ایک جست میں میرے آملے کے تیل کی بوتل توڑ دی۔ چاچا۔ ٹب میں پانی ڈال رہا تھا۔ اس نے پاؤں سے چپل نکال کر جو "شاہین کافوری" پر پھینکی تو میری دھوپ کی عینک چکنا چور ہو گئی۔

خانہ بدوشوں کے ڈیرے سے بھورے رنگ کا ایک قد آور کتا سہ پہر کی چائے پر آ کر مجھ سے ایک دو "سینڈ وچ" ڈبل روٹی کے لے جاتا ہے۔ جسم پر اتنی گنجان پشم ہے کہ جیسے پشمینے کا کمبل اوڑھ رکھا ہو۔ مسخرا کچھ اس متوقع زاویے سے دم ہلاتا ہے اور اس کی آنکھوں میں چاپلوسی کے کچھ ایسے ترمہرے ڈوبتے ابھرتے نظر آتے ہیں کہ ان کو دیکھ کر بعض اوقات جب میں خود اپنے اندر جھانکتا ہوں تو یوں لگتا ہے جیسے میں بھی اپنے افسر اعلیٰ کے سامنے کھڑا دم ہلا رہا ہوں —— اگر لقمہ نہ دوں تو کبھی کبھی مجھ پر غرانے بھی لگتا ہے۔ جس طرح بعض بھک منگے —— زمین کھا گئی پہلوان کیسے کیسے۔

زمین کھا گئی پہلوان کیسے کیسے۔

۳۰ رجون

ایک مشہور شاعر کا مکتوب ملا۔

اشعار کی بھرمار پہ احوال ندارد۔

ذاتی طور پر بھلے آدمی ہیں۔ مگر آبائی شہر کی تاریخی شہرت داغ دار چلی آ رہی ہے وہاں کے لوگوں کا —— "میں" اور "میرا" بہت موٹا ہے۔ یہ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں

پانی جس زمین سے نکلتا ہے۔اس کالوہا۔چونا اپنے اندر رکھتا ہے۔ادبی تنقید کی آڑ میں اپنے ہم عصر شاعروں پر طنز کے تیر برساتے رہتے ہیں۔میں عبدالعزیز خالد کے فن وفکر کا دیرینہ مداح ہوں۔ایک مرتبہ یہ صاحب خالد کے ایک شعر کے بارے میں پوچھنے لگے۔بتاؤ اس سے معنی کے کتنے ترشول نکلتے ہیں؟ میں سمجھ گیا ان کا مقصود میری علمی کم مائیگی کا مذاق اڑانا تھا۔سو میں ــــــ ہنس دیا مسکرادیا۔

ان دنوں آپ علیل ہیں۔جتنی بیماری بڑھتی ہے اتنی شراب بڑھادیتے ہیں۔لکھتے ہیں میرے خطوط کی فائل (FILE) کھول لو۔نوازش نامے کے ہمراہ ــــــ "وصیت نامے" کی پہلی قسط بھی منسلک کر دی ہے۔چند اشارات ہیں جن کو "وصیت نامے" کی کنجی کہنا چاہیئے۔مثلاً ــــــ جہاں جہاں شیخ اختر الدین کا نام آئے، وہاں وہاں "اختری بائی فیض آبادی" ــــــ پڑھیئے ــــــ گائے کا لباس پہن کر شیر کا شکار کرنا کوئی ان سے سیکھے۔

حکیم سینا

یہ ان مشہور حکیم بو علی سینا کا تذکرہ نہیں جو علم طب کے امام مانے گئے ہیں۔ جن حکیم سینا کا تذکرہ میں کر رہا ہوں اگرچہ ویسے خود بھی بھی اپنے آپ کو وقت کا بو علی سینا ہی سمجھتے تھے مگر عملاً ہمارے شہر کی ایک ایسی تنگ و تاریک، تنلی سی گلی میں مطب کرتے تھے جہاں طبیب و مریض تو بڑی چیزیں ہیں بہ نفسہ علم طب کا گزر بھی مشکل معلوم ہوتا تھا۔ لیکن انسان وہ مخلوق ہے کہ جب کچھ کرنے پر آتا ہے تو ایک شاعر کے بقول ع

سمندر چیرتا ہے کوہ سے دریا بہاتا ہے

اور جب ایک دوسرے شاعر کے بقول۔ کچھ بھی کرنے کو نہیں جی چاہتا۔ تو اس گلی میں مطب تک کر لیتا ہے ع

جینا اسی گلی میں مرنا اسی گلی میں

طبیب کی حیثیت سے حکیم سینا کی شہرت صرف اسی قدر تھی کہ وہ تقریباً اسی نوے برس تک زندہ رہے۔ شہرت سے زیادہ لوگوں کو ان کی سخت جانی پر حیرت تھی کہ جس تنگ دستی مگر بھرم، جس وضع داری کے ساتھ انہوں نے زندگی بسر کی ہے وہ اتنی مدت تک زندہ ہی کیونکر رہ سکے تھے۔ محلے کی طرف سے کمیٹی کے ہنسوڑ ممبر بابو مولا داد سیاہ نویس اکثر کہا کرتے تھے کہ حکیم سینا اگر اسی گلی کے نکڑ پر خوانچے میں مونگ پھلی لے کر بیٹھ جاتے تو زیادہ آسودہ ہوتے مگر حکیم صاحب تھے کہ جہاں ایک مرتبہ بیٹھ گئے تھے بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ پچھلی صدی کے چوتھے یا تیسرے ربع میں ان کے والد مرحوم جو عطاری کا دھندا کرتے تھے، جہاں ان کو بٹھا گئے تھے وہ پھر وہاں سے اٹھے نہیں۔ آخر آخر میں تو خیر کئی سال سے بذات خود ان کا جینا صحیح معنوں میں بے معنی ہو چکا تھا مگر بھلے دنوں میں بھی اہل الرائے اصحاب کی رائے یہ تھی کہ حکیم سینا اور امام مسجد مولوی لطف اللہ خان علی الترتیب کے علاوہ کوئی دوسرا دھندا کر ہی نہیں سکتے۔ مولوی لطف اللہ خان تو نسبتاً پھر بھی آسودہ حال تھے مگر حکیم صاحب کا حال ساری عمر یہ رہا کہ محلے کی بوڑھی خوش عقیدہ عورتوں کو جب کبھی اللہ کی رزاقی و قدرت پر گفتگو مقصود ہوتی تو مثال کے طور پر وہ پتھر کے سینے میں جینے والے کیڑے اور اندھی گلی میں مطب کرنے والے حکیم سینا کا تذکرہ عموماً ایک ہی سانس میں کیا کرتیں۔

حکیم سینا میری طفلی ہی کے زمانے میں جس کو آج پچیس تیس برس گزر چلے ہیں، اس مقام پر پہنچ چکے تھے جہاں کوئی آدمی اپنی افادیت کھو دینے کے بعد محض ایک رائے، چرچا مشغلہ یا قہقہہ رہ جاتا ہے۔ ہمارا شہر کچھ اس قسم کا ہے جہاں ہر

شخص ہر شخص کو جانتا ہے بلکہ لوگ ایک دوسرے کے شجرۂ نسبت تک سے واقف ہیں۔ چنانچہ شہر کا ایک معروف و معزز شخص جو وزیر تک رہ چکا ہے اب تک میاں حشمت علی مالشی ہی کہلاتا ہے۔ یہ دراصل ایک بڑا قصبہ ہے۔ جس کو زرعی ملک سیر چشمی نے شہر کا نام دے رکھا ہے۔ حکیم سینا کو شہر کا بچہ بچہ جانتا ہے۔ بلکہ بڑوں کو چونکہ مدت سے ان میں کوئی دلچسپی باقی نہیں رہ گئی تھی اس لئے شہر کے بچے ان کو کچھ زیادہ ہی جانتے تھے۔ مجھے جس وقت ابھی یہ تمیز بھی نہ تھی کہ طبیب کسے کہتے ہیں اور مطب کیا ہوتا ہے، یہ معلوم تھا کہ لہراتی ہوئی سفید ڈاڑھی والا مردِ بزرگ جو ہر روز شام کو بلاناغہ ہاتھ میں موٹا سا عصا لے کر ایک مقررہ راستے پر سیر کو نکلتا ہے، حکیم بوعلی سینا ہے۔ ذرا بڑا ہوا تو ان کے متعلق اور بہت سی باتیں معلوم ہو گئیں۔ مثلاً یہ کہ ان کا نام تو عبدالوہاب یا عبدالصبور تھا مگر اپنے آپ کو خاکپائے بوعلی سینا کہتے تھے۔ جو کثرتِ استعمال سے گھس کر صرف سینا رہ گیا تھا۔ کسی طبیب یا طبی درسگاہ کے فن کی تحصیل قطعاً نہیں کی تھی لیکن خود کو فن کا مجتہد سمجھتے تھے۔ خود بہت چلتے تھے مگر مطب بالکل نہیں چلتا تھا۔ "معمولی عوارض" کا علاج یہ نہیں کرتے تھے اور "بڑے امراض" کے مریض ان سے علاج نہیں کرواتے۔ عمر بھر شادی نہیں کی، زندگی عسرت میں بسر ہوئی مگر متبنّیٰ رکھنے کا شوق اتنا ہے کہ کوئی ڈیڑھ درجن متبنّیٰ بدل چکے ہیں آگ پر پکی ہوئی کوئی چیز نہیں کھاتے چنانچہ ۱۹۲۵ء تک وہ اپنے اس معمول پر پچیس برس کی پابندی کا ریکارڈ قائم کر چکے تھے۔ گوگری کے کلاہ پر نیلے رنگ کی جو پگڑی باندھ کر نکلتے ہیں وہ گذشتہ بیس برس سے بندھی پڑی ہے۔ مطب میں مریض ملنے کو آجائے تو اس کو تضیع اوقات گردانتے ہیں۔ طبیعت میں تلخی ہے، مزاج چڑچڑا ہے

عمر بڑی، صحت اچھی البتہ ایک سے ایک دلچسپ تر سینکڑوں باتیں ان سے منسوب اور زبان زد عام تھیں۔

حکیم سینا سے میری باضابطہ ملاقات اس وقت ہوئی جب میں زندگی میں داخل ہونے کے لئے شہر سے باہر چلا جا رہا تھا۔ حکیم صاحب اس وقت عمر کے اس مقام پر کھڑے تھے جس کے بعد آدمی اچانک کسی دن مر جاتا ہے مگر اس سے زیادہ بوڑھا نہیں ہو سکتا مطب گھر پر ہی تھا بلکہ جیسا کہ بعد میں دیکھا گھر مطب میں تھا۔ چھوٹی اینٹوں کا چھوٹا سا پرانا مکان تھا جس کی بوسیدہ بیرونی دیواروں کے کئی مختلف شگافوں میں سے دس پندرہ کائی اور سونبھنے کے لاڈلے پودے اور بیری اور شہتوت کے معزز درخت بیک وقت پروان چڑھتے ہوئے ایک دوسرے پر چڑھ گئے تھے۔ مکان اور درختوں کا رشتہ اتنا قدیم و محکم تھا کہ اب مکان ان ہی کے سہارے کھڑا تھا۔ غالب نے کسی ایسے ہی مکان کی نسبت کہا ہو گا۔

دشت کو دیکھ کر گھر یاد آیا

مطب والی کوٹھڑی گلی میں کھلتی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ بند ہوتی ہی نہ تھی۔ اندر پہنچا تو عام شہرت کے مطابق مطب بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ حکیم سینا متروک وضع کے ایک پرانے صوفے کی لمبی نشست پر دراز تھے۔ سامنے بے دلی سے چھلا ہوا دیار کا ایک گرانڈیل میز پڑا تھا جس پر تنگ اور چوڑے دہانوں کی گنی چنی سات بوتلیں رکھی تھیں جن میں سے بالخصوص سرمئی رنگ کی ایک بوتل میں سفید سفید گولیاں مطب کے نمناک دھندلکے میں بھی چمک رہی تھیں میز سے لگی ہوئی بے بازو کی دو چوکیاں تھیں اور دیواروں کے تین چار کشادہ طاقوں میں بے شمار چھوٹی بڑی بوتلیں گرد و غبار میں

اس اطمینان کے ساتھ اٹی پڑی تھیں کہ اب ان کو چھیڑنے سے نہ معلوم کتنی صدیوں کی دل آزاری کا احتمال ہوتا تھا۔ ان کے علاوہ پھٹے پرانے کپڑے، مختلف طول و عرض کے کھرل اور انواع و اقطاع کے ہاون دستے بے ترتیبی سے پڑے تھے۔

میری آہٹ سن کر حکیم صاحب اکڑوں ہو کر بیٹھ گئے۔ وہ پہلے مجھے کوئی مریض ہی سمجھے۔ نبض کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولے:۔

"کیا عارضہ ہے؟"

میں نے عرض کیا محض اشتیاقِ ملاقات کھینچ لایا ہے۔ اس پر اپنے خشونت آمیز روکھے پن کو چہرے کی شکنوں سے ظاہر کر کے پہلو سمیٹتے ہوئے بولے:۔

"آپ غالباً اس شہر میں نووارد ہیں۔ میں نے اس قسم کی ملاقاتوں کو کبھی نہیں سراہا خیر اب آپ آ ہی گئے ہیں تو بیٹھئے۔ لیکن پہلے ذرا میز پر سے میری عینک اٹھا دیجئے مہربانی۔ مگر نہیں۔ رہنے دیجئے۔" اور پھر خود ہی عینک اٹھاتے ہوئے کہا "میں نے زندگی بھر اپنا ہر کام اپنے ہاتھ سے کیا ہے۔ یہ عادت کچھ ایسی راسخ ہو چکی ہے کہ مثلاً اب آپ عینک اٹھا کر دیتے تو بہت ممکن تھا مجھے اس میں سے کچھ سجھائی ہی نہ دیتا۔

"اچھا"، میں کچھ تعجب سے بولا۔

"نہیں" "یہ نئی پود اس بات کو سمجھ ہی نہیں سکتی۔ تم لوگ معاف کرنا یہ چاہتے ہو کہ تمہاری جگہ حوائج فطریہ بھی کوئی دوسرا ہی بھگتا آئے۔" پھر عینک کو ناک کی گھوڑی پر سوار کرتے ہوئے بولے "لیجئے اب بات کیجئے۔ کیا کہوں میری کچھ ایسی عادت ہو گئی ہے کہ عینک کے بغیر میں گفتگو بھی نہیں کر سکتا ہوں تو آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟ کون ہو عزیز من؟"

اس تمہید کے بعد اس روز کوئی تین گھنٹے ہماری سیر حاصل ملاقات رہی۔ کہاں تو ان کی نسبت یہ مشہور تھا کہ وہ کاٹ کھانے کو دوڑتے ہیں اور کہاں یہ کیفیت جو میں نے دیکھی کہ بیچ میں تین چار مرتبہ اٹھنا چاہا تو زبردستی بٹھا بٹھا لیا۔

ان سے اپنی پوری گفتگو قلم بند کرنے کے لئے تو ظاہر ہے کم از کم تین ہی گھنٹے چاہئیں۔ بہرحال خلاصہ کلام یہ کہ حکیم صاحب اپنے آپ کو واقعی دیانتداری کے ساتھ وقت کا بوعلی سینا سمجھتے تھے۔ بوعلی سینا تو خیر ان کے پیکر میں دوبارہ پیدا ہو ہی گئے تھے لیکن ان میں بقراط، سقراط، ابونصر اور نہ جانے کن کن دوسرے حکماء اجل کی خوبیاں بھی مجتمع تھیں۔ اس لئے ان کے نزدیک ان کے پایہ کا طبیب آئندہ پیدا ہی نہیں ہو سکتا صوفیا سے وہ شاکی ضرور تھے مگر اس طرح جیسے کوئی باپ نالائق اولاد سے شکایت کرتا ہو۔ انسانوں کو وہ چمگادڑ سمجھتے تھے جو چشمہ آفتاب کی روشنی سے محروم ہے۔ فن میں اپنی عظمت کا شعور و غرور ان میں اتنا قوی تھا کہ اس پر جان کی بازی لگا بیٹھتے اور حقائق سے کسی قیمت پر سمجھوتہ کرنے پر آمادہ نہ ہوتے وہ کہتے تھے کہ بشری کمزوری کے بعض لمحوں میں جب کبھی ان کے ذہن میں طب چھوڑ کر کوئی دوسرا دھندا کرنے کا خیال آیا تو اسی رات حکیم جالینوس، بقراط خود حضرت بوعلی سینا اور علم طب کے بعض دوسرے اعالی واکابر خواب میں آکر کبھی لعنت ملامت کرتے، کبھی ہاتھ جوڑ کر منت سماجت، کہ دیکھ اس دور میں طب کی ایک ہی تو شمع فروزاں رہ گئی ہے۔ حکیم سینا دراصل ان باوضع اطباء میں سے تھے جو فن کو اس کی بقا کے لئے سینے سے لگائے ہوئے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ نہ فن زندہ تھا نہ خود آپ پھر بعض نازک مزاج باکمال شعراء کی طرح وہ اپنے آپ کو ایک مقدس قومی امانت

سمجھتے تھے ان کی عزت و آسائش کے ساتھ زندہ رکھنا قوم کا فرض تھا اور ان کا اپنا فرض صرف اتنا تھا کہ بس وہ پیدا ہو گئے میرا اپنا خیال یہ ہے کہ حکیم صاحب اگر "بوعلی سینا" نہ ہوتے تو "میر تقی میر" ہوتے۔

بحر گر بحر نہ ہوتا تو بیابان ہوتا

ہر چند وہ اب قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے تھے مگر مستقبل کی طرف سے مایوس ہرگز نہ تھے۔ یہ سوچے بغیر کہ اس گلی میں بکری کا بچہ بھی گزر سکتا ہے کہ نہیں اس بات کا پختہ یقین تھا کہ قوم ایک دن ہاتھی گھوڑے لے کر ان کے دروازے پر پہنچے گی اور مرنے کے بعد ان کے جنازے پر خلق خدا کا ہجوم دیدنی ہوگا۔ انہوں نے بڑے تیقن کے ساتھ مجھ سے کہا تھا "میں اپنی کامیابی کو اس طرح دیکھ رہا ہوں جیسے اس وقت تمہیں دیکھ رہا ہوں۔ مجھے بس معرکے کے ایک مریض کا انتظار ہے۔"

مجھے اعتراف ہے کہ میں حکیم صاحب سے اس پہلی ملاقات میں کافی متاثر ہوا تھا ان کی مضبوط قوت ارادی حیرت انگیز تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ ملنے والا ترحم اور سراسیمگی کی ملی جلی کیفیات کے ساتھ ان کی شخصیت سے ایک گونہ اثر ضرور قبول کرتا تھا۔ بالکل اس طرح جیسے کسی تاریخی قبرستان کے کھنڈروں میں سے ایک خاص عظمت و جبروت کا احساس ہوتا ہے۔ اس ملاقات کے بعد مختلف وقفوں میں حکیم صاحب سے میری تین چار ملاقاتیں اور ہوئیں۔ میرے کاروبار کی نوعیت ایسی ہے کہ سال میں بمشکل ایک مرتبہ اپنے آبائی شہر میں آنے کی فرصت ملتی ہے مگر جب کبھی موقعہ ملتا میں حکیم صاحب کی خدمت میں ضرور حاضر ہوتا۔

ایک مرتبہ اثنائے گفتگو میں میں نے جدید زمانے کے تقاضوں کی طرف اشارہ

کرتے ہوئے پراپیگنڈے کی اہمیت پر زور دینا چاہا تو حکیم صاحب اس طرح بھڑک اٹھے کہ ان کی عمر کا آدمی اس شدت سے بالعموم بھڑک بھی نہیں سکتا۔ غضب ناک ہو کر بولے :

"کیا کہا پراپیگنڈا؟"

"جی ہاں"

"جی نہیں مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا نہیں ہو سکتا نہیں ہو سکتا۔ اب تم یہ بھی کہو گے کہ بازار میں جا کر مجمع بھی لگایا کروں ؟ ____ صاحبزادہ صاحب ! شک آنست .... اور پھر میز پر سے سفوف کی دو بوتلیں اٹھا کر باہر گلی کی بدر رو میں پھینکتے ہوئے کہا "یہ لو آج میں نے انسانوں کی بدبختی پر ایک اور مہر ثبت کر دی اگر کسی کتے نے اس نالے میں سے ایک بوند بھی پی لی تو دیکھ لینا کہ وجع المفاصل اور عرق النساء کے امراض سے محفوظ و مامون ہو جائے گا۔ مگر انسانوں کے لئے ان امراض کی شفا اب دنیا سے اٹھ گئی۔ اٹھ گئی ____" اور حکیم صاحب خود بھی اٹھ کر کرب کی ایک خوفناک کیفیت میں ادھر سے ادھر ٹہلنے لگے۔

مدت کے بعد پھر حاضر ہونے کا اتفاق ہوا تو میز کی پانچ بوتلوں میں سے تین ہی سلامت رہ گئی تھیں۔ معلوم ہوا کہ اس درمیان میں آپ صرع اور سرطان کا بیڑا بھی غرق کر چکے ہیں۔ اس مرتبہ ان کی امیدیں بڑی تیزی سے ایک ایسی مایوسی میں بدلتی جا رہی تھیں، جن میں انسانوں کے خلاف نفرت اور جذبہ انتقام کی جھلک صاف نظر آتی تھی۔ انہوں نے بیس برس کی بندھی ہوئی پگڑی کھول کر اس کی جگہ یہ عہد باندھ لیا تھا کہ اب میت ہی دہلیز سے باہر نکلے گی۔ ایک خدا ترس ہمسائے کی معرفت

پرانی بوتلیں۔ معجونوں کے مرتبان۔ ہاون دستے اور کھرلیں بیچ بیچ کر کھا رہے تھے۔ اپنا پلنگ موجود تھا مگر منتبنٹی والی چارپائی غائب تھی۔ میں نے مزاج پرسی کی تو کہنے لگے۔

"اور تو کچھ نہیں، ہاں یہ صدمہ ضرور ہے شمس میاں کہ میں زندہ ہوں اور دنیا مر رہی ہے۔ مگر خیر۔ اللہ کے بھیجے ہوئے کتنے سچے رسول بھی بظاہر اپنے مشن میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اس ملاقات میں یہ لطیفہ بھی ہوا کہ میرے بیٹھے بیٹھے خدا معلوم کہاں سے اور کیوں خاصی معقول وضع کا ایک مریض لنگڑاتا لنگڑاتا مطب میں آنکلا — میں خوش ہوا کہ شاید حکیم صاحب کی ساعت مراد آپہنچی مگر وہ تو اسے دیکھتے ہی آگ بگولا ہو گیا۔

"اب آئے ہو وجع المفاصل لے کر جب چڑیاں چگ گئیں کھیت"

"لیکن قبلہ" مریض بولا — "میرا مرض ابھی کچھ زیادہ پیچیدہ نہیں ہونے پایا"

"جی ہاں، میں نے بھی مداخلت کی"

"جی نہیں" حکیم صاحب بولے "بندہ نواز شِ مرض کی شفا اب انسانوں کے مقدر ہی میں نہیں رہی۔ اب تو لوگوں کو وجع المفاصل سمیت ہی جینا پڑے گا پھر مجھ سے مخاطب ہو کر "میاں" "میرا خیال ہے کہ خط نسخ کوفی میں اس مضمون کا طغرا لکھ کر بازار میں آویزاں کرا دوں؟"

مجھے معلوم تھا کہ حکیم صاحب اس دوا کی بوتل ہی توڑ چکے ہیں مگر اس خیال سے کہ آیا ہوا مریض ہاتھ سے نہ نکلنے پائے میں نے پھر گذارش کی۔

"قبلہ وہ دوا دوبارہ بھی تو بنائی جا سکتی ہے"

"جی نہیں۔ وہ نسخہ مسلسل بارہ برس کی ریاضت چاہتا ہے اور وجع المفاصل

کا مریض پانچ برس سے زیادہ ٹھہر نہیں سکتا۔

یہ سن کر مریض کے پیر تلے کی زمین نکل گئی۔ پہلے اس نے کانسی کے پیالے میں صراحی سے پانی انڈیل کر پیا اور پھر پہلے سے بھی زیادہ لنگڑاتا ہوا واپس چلا گیا۔ لیکن ابھی اس کی ایک ہی ٹانگ دہلیز کے پار ہوگی کہ حکیم صاحب بولے:

"شمس میاں مجھے اس شخص کی جوانا مرگی کا بڑا رنج ہو گا مگر کیا کر سکتا ہوں شمس میاں بخدا مجھے اس وقت کے تصور ہی سے ہول آتا ہے جب لوگ پاگلوں کی طرح پکار پکار کر مجھے آوازیں دیں گے مگر حکیم سینا اس دنیا میں نہیں ہو گا۔"

حکیم صاحب سے میری آخری ملاقات دلچسپ ترین ملاقات ثابت ہوئی مطب کی ویرانی پہلے سے سوا تھی۔ میز پر صرف سفید گولیوں والی ایک سرمئی بوتل رہ گئی تھی۔ پلنگ تک اٹھ چکا تھا مگر چہرے سے وہ گھٹا ٹوپ مایوسی چھٹ چکی تھی۔ جتنی بشاشت اس مرتبہ میں نے ان کے چہرے پر دیکھی پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ مجھ سے تقریباً لپٹتے ہوئے بولے:

"بھئی بڑے اچھے موقع پر آئے! آج میں اپنی زندگی کا سب سے بڑا تجربہ کرنے والا ہوں۔ زندگی کی سب سے بڑی کامرانی سے ہمکنار ہونے والا ہوں۔" (میز والی بوتل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) دیکھتے ہو یہ کیا ہے؟"

"جی ہاں۔ بوتل ہے۔"

"جی نہیں۔ بوتل نہیں ہے۔ میری زندگی ہے۔ اس میں علم طب کا وہ راز ہے جو آج تک نہیں کھل سکا۔ بس آج ہی کھلے گا۔"

"خوب۔ بہت خوب!"

"حیرت سے میرا منہ کیا تک رہی ہو؟ اس نسخے کے اجزا خود بو علی سینا رحمۃ اللہ علیہ نے عالم رویا میں اس عاجز پر منکشف فرمائے تھے اور فرمایا تھا کہ اس میں بقراط و سقراط کی روحیں بند ہیں ——— چاند اور ستارے بند ہیں!"

"یعنی پھر تو واقعی بے حد عجیب چیز ہوئی۔"

"اور پھر حضرت نے فرمایا تھا کہ تمہاری زندگی میں فشار الدم کا ایک لاعلاج مریض آئے گا یہ گولیاں اس پر آزمانا۔"

"تو پھر آپ نے آزمائی؟" میں نے شوق کی بے تابی سے پوچھا۔

"کس پر آزماتا۔ تم پر؟ ——— وہ قدرے جھلا گئے مگر فوراً ہی دھیمے بھی ہو گئے آج وہ موعود مریض پہنچا ہے جس کی بشارت آج سے پچاس ساٹھ برس پہلے مجھے دی گئی تھی۔ اور ہاں۔ حضرت نے یہ بھی فرمایا تھا کہ اس کے بعد تجھ پر رزق، شہرت عزت کے چالیس دروازے کھل جائیں گے۔ میں سمجھتا ہوں وہ مبارک ساعت آ گئی ہے مگر شمس میاں میں سوچتا ہوں کہ اگر اس طرح مجھ پر یک بارگی چالیس دروازے کھل گئے تو میں کس کس دروازے سے گزرا کروں گا؟

اس کے بعد حکیم صاحب نے پورے تحمل کے ساتھ ساری روداد سنائی کہ فشار الدم کا ایک مایوس العلاج مریض کل اچانک ان کے ہاں آ گیا تھا۔ خود مریض کو تو معلوم نہیں کہ اسے کیا مرض ہے مگر حکیم صاحب کی تشخیص تھی کہ اسے فشار الدم ہی کا عارضہ تھا۔ آج وہ معالجہ کے لئے مطب میں آنے ہی والا تھا کیونکہ ان گولیوں کا تجربہ حکیم صاحب خود اپنے سامنے کرنا چاہتے تھے۔ گولیوں کے سلسلے میں حکیم صاحب نے بتایا کہ بہت مدت ہوئی انہوں نے ایک ناگوری بیل پر دو گولیاں آزما کر دیکھی تھیں

جس کا ردعمل خاطر خواہ نظر آیا۔ بیل تو خیر ردعمل کے صیغے میں صرف اچھلتا کودتا ہی رہا لیکن حکیم صاحب کی رائے میں بیل کو دراصل بقراط اور جالی نوس دکھائی دے رہے تھے۔ اس مرحلہ پر میں نے پوچھا کہ آخر بقراط اور جالینوس کے نظر آجانے سے مرض کیونکر دور ہو سکتا ہے تو اس کے جواب میں حکیم صاحب نے اقبال کا یہ مصرع پڑھ دیا کہ ع

"نگاہ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں"

ہم یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ بیچ مچ مریض آگیا جو بظاہر ہٹا کٹا گنوار دیہاتی نوجوان تھا۔ بات کی تو معلوم ہوا کہ فشار الدم کا مریض تو ہو یا نہ ہو ذہنی خلفشار کا مریض یقیناً تھا بدحواس، پریشان خیال، پریشان وضع۔ بہرحال حکیم صاحب نے صوفے ہی پر اپنے پاس بٹھا کر کنوئیں کے آب تازہ کے ساتھ دق نقرہ میں لپٹی ہوئی ایک گولی اس کے حوالہ کر دی جس کو حلق سے اتارنے کے بعد مریض فوراً بولا:

"میٹھی ہے۔ دو تین اور دیجئے" ! حکیم صاحب سنی ان سنی کر کے نبض تھام کر ردِ عمل کے انتظار میں بیٹھ گئے۔ کچھ وقفہ کے بعد مریض سے پوچھا:

"کیوں میاں کیا کچھ محسوس ہو رہا ہے؟" ــــــــ جس کے جواب میں مریض نے دونوں آنکھیں بند کر کے گردن کو اس زور سے اپنی چھاتی پر پھینک دیا کہ اگر رگ پٹھے مضبوط نہ ہوتے تو کچھ عجب نہ تھا کہ گردن ٹوٹ کر باہر جا گرتی۔ حکیم صاحب بولے اب ان پر غنودگی طاری ہو رہی ہے۔ ناگوری بیل پر اسی طرح پہلے غنودگی طاری ہوئی تھی پھر مریض کو خواب آتا ہے۔ پھر بقراط۔ جالینوس۔ چاند۔ ستارے......" حکیم صاحب ردعمل کے مختلف مراحل پر روشنی ڈال رہے تھے کہ ادھر مریض پر ردعمل شروع بھی ہو گیا

ردعمل کیا تھا اچھلنے کودنے کا ایک مضحکہ انگیز سلسلہ تھا۔ مریض صوفے سے اچھل کر میز پر جا بیٹھتا اور میز سے اچھل کر صوفے پر۔ حکیم صاحب جو نبض کو کسی حالت میں چھوڑنے پر تیار نہ تھے اس ردعمل میں برابر کے شریک تھے۔ کچھ دیر کی اچھل کود کے بعد پاپان کار مریض بے ہوش ہو کر میز پر اس طرح جا لیٹا جیسے عامل کے سامنے معمول پڑا رہتا ہے۔ اس پر حکیم صاحب نے گردوپیش پر یوں نظر ڈالی جیسے کوئی قلعہ سر کر لیا ہے۔

"لیجیے اب ردعمل شروع ہوتا ہے۔"

"جی ہاں ——"

"جی نہیں —— ابھی کیا ہے۔ آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔"

"اور پھر مریض پر جھکتے ہوئے"

"کیوں میاں؟"

"ارے کچھ بولو تو سہی۔"

"ہاں بھئی کہو کوئی چیز نظر آئی؟"

"ہاں —— کچھ ہے تو سہی۔" مریض مری سی آواز میں بولا۔

"کیا ہے؟" حکیم صاحب فرط مسرت سے بچوں کی طرح اچھل کر بولے:

"کیا ہے سورج۔ چاند۔ ستارہ۔ انسان ——"

"ابھی تو ایک لمبا سا کان لٹک رہا ہے۔"

"الٰہی تیرا شکر! —— میاں میرا خیال ہے کہ حکیم بقراط ابھر کر سامنے آ رہے ہیں۔ کتابوں میں آیا ہے کہ حکیم بقراط کے کان غیر معمولی طویل تھے (مریض سے) ہاں

تو کوئی چیز بھی دکھائی دی؟"

"جی ہاں۔ چھوٹی چھوٹی آنکھیں۔ بڑے بڑے دانت ..."

"شاباش! ــــ یہ سمجھو تمہارا نصف مرض جا چکا ــــ دیکھا شمس میاں ان گولیوں کا طلسمی تصرف؟"

"جی ہاں" میں بولا۔"

"جی نہیں" حکیم صاحب "جی ہاں" کو کم ہی برداشت کرتے تھے۔ دیکھتے جاؤ ابھی تو اس شخص کے کف دست پر شمس و قمر اترنے والے ہیں۔ بخدا اس وقت اگر یہ شخص چاہے تو پورے نظام شمسی کو ادھر سے اٹھا کر ادھر پھینک دے (مریض سے مخاطب ہو کر) ــــ ہاں تو بھئی اور کچھ ..."

"دُم؟ ــــ لمبی دُم ــــ" مریض یکبارگی چلایا ــــ اس کی آواز میں خوشی کا جذبہ تھا ــــ "دُم؟" ــــ حکیم صاحب دم بخود ہو گئے ــــ "دُم؟ شاید کوئی دم دار ستارہ طلوع ہو رہا ہے" ــــ اتنے میں مریض پورے زور سے چلایا ــــ وہی ــــ بالکل وہی ــــ ہمارا اپنا کیدیا گدھا۔"

"گدھا؟ ــــ لاحول ولاقوۃ ــــ میرا خیال ہے مریض کو ایک اور گولی درکار ہے" ــــ حکیم صاحب میز پر سے بوتل اٹھا ہی رہے تھے کہ ناگاہ دو اجڈ سے دیہاتی مطب میں داخل ہوئے جن میں سے ایک نے آتے ہی زن سے ایک طمانچہ مریض کی کنپٹی پر جما دیا۔

"حرام خور کہیں کا ــــ کہاں بھیجا تھا اور کہاں آ کر لیٹا ہوا ہے اٹھ بے ــــ اٹھتا ہے یا ــــ اور مریض اٹھ کر بیٹھ گیا۔ حکیم صاحب اور

ہیں دونوں ہکا بکا تھے کہ ماجرا کیا ہے۔ پتہ چلا کہ یہ لوگ تو ایک نواحی گاؤں کے کمہار تھے۔ کئی روز سے ان کا ایک گدھا کھو گیا ہے۔ "مریض" ان کا ایک نیم فاتر العقل بھتیجا تھا جو تین دن سے گدھے کی تلاش میں نکلا ہوا تھا۔

یہ سن کر حکیم صاحب نے سفید گولیوں والی وہ آخری بوتل بھی باہر نالی میں پھینک دی۔

عجب آزاد مرد

مسٹر لیننگان مقامی ریلوے کالونی میں تنہا اینگلو انڈین رہ گیا تھا۔ باقی تمام اینگلو انڈین نوکری سے رفتہ رفتہ سبک دوش ہو کر ولایت یا آسٹریلیا جا چکے تھے۔ جو سمندر کے سفید ملکوں تک نہیں پہنچ سکے وہ کراچی میں جا آباد ہوئے کہ وہاں کی ساحلی فضا اور بین الاقوامی ماحول میں ان کی معاشرتی و تمدنی تسکین کا کچھ سامان موجود تھا۔ مگر مسٹر لیننگان انجن ڈرائیور ابھی تک اس کالونی میں پڑا تھا جو اینگلو انڈین نقطۂ نگاہ سے اب بالکل ویران، افسردہ اور مردہ ہو چکی تھی۔

وہ یوں بھی تنہا تھا۔ اس کی بیوی کو مرے ایک سال ہو چکا تھا جس کی تاریخ وفات اس نے اپنے پلنگ کے سامنے دیوار کی سفیدی پر پنسل سے لکھ رکھی تھی۔ اس کے نیچے دوسری طرف میں وہ تمام خرچ لکھا ہوا تھا جو مسز لیننگان کی تجہیز و تکفین پر اٹھا تھا مسٹر لیننگان کے تین بچے تھے۔ دو لڑکیاں ایک لڑکا۔ لڑکیاں فینی اور نینی جنگ کے

دوران میں فوجی گوروں کے ساتھ شادی کر کے افریقہ چلی گئی تھیں، اور جب سے گئی تھیں انہوں نے بوڑھے لینگان کو خط بھی نہ بھیجا رسید کا۔ لڑکا، رابرٹ۔ ماں کی موت کے بعد گھر کا تمام فرنیچر فروخت کر کے پچھلے چھ ماہ سے لاپتہ تھا۔ سننے میں آیا تھا کہ وہ مسز ولیم نام ایک بیوہ مبہم ٹائپسٹ کے عشق میں گرفتار ہو کر کراچی جا پہنچا تھا یہ مسز ولیم پچھلے سال تک اسی کالونی میں مسٹر لینگان کے بازو والی کوٹھی میں رہتی تھی۔

مسٹر لینگان سے میری ملاقات مکان کے سلسلہ میں ہوئی اور مجھے اعتراف ہے کہ پہلی ہی ملاقات میں وہ مجھے بے حد دلچسپ، پر لطف اور غیر معمولی کردار معلوم ہوا۔ مجھے مکان کی جستجو تھی۔ کسی نے مشورہ دیا کہ ریلوے کالونی میں قسمت آزمائی کرو، ممکن ہے وہاں کوئی شخص مکان کا کچھ حصہ آگے کرائے پر دے ڈالے۔ کیونکہ ریلوے نے چھوٹی چھوٹی تنخواہ کے ملازموں کو بھی بڑے بڑے کوارٹر اور کوٹھیاں دے رکھی ہیں اور اس کالونی میں لوگ اکثر ایسا کرتے رہتے ہیں۔

دونوں طرف سے ملازموں کی ابتدائی گفتگو کے بعد ایک روز تفصیلات طے کرنے کے لئے میں خود مسٹر لینگان کے ہاں پہنچ گیا۔ وہ اگرچہ انجن ڈرائیور ہی تھا، مگر سفید گریڈ میں تھا۔ کہ ریلوے میں اب تک یہ سفید اور کالے گریڈ چلے آتے ہیں۔ ایک اچھا خاصا بنگلہ اسے ملا ہوا تھا، چار مربع کشادہ کمرے، ہر کمرے میں چھت کا پنکھا، تین غسل خانے ہر غسل خانے میں پانی کی ٹونٹی، سامنے نہایت خوبصورت برآمدہ، عقب میں علیحدہ باورچی خانہ اور سرونٹ کوارٹرز، تین طرف پھیلا ہوا باغیچہ جن میں مسلسل بے توجہی کے باعث گلاب کے پودے کھڑے کھڑے سوکھ گئے تھے۔ اور گنجان خودرو بھنگ کی جھاڑیوں نے جنگل کا منظر پیدا کر رکھا تھا۔ مسٹر لینگان اپنے تمام اثاثے سمیت ایک کمرے اور

ایک غسل خانے میں سمٹا ہوا تھا۔ باقی تین کمرے خالی تھے، جو میرے لیے بہت تھے۔

گنگو، جو بیک وقت کوٹھی کا جمعدار اور صاحب بہادر کا خانساماں تھا، مجھے اس کی کوٹھڑی میں لے گیا۔ کمرے کے وسط میں ایک پلنگ بچھا تھا اور مسٹر لینگان آنکھیں بند کئے بستر پر دراز تھا مگر مسٹر لینگان کا ہے کو تھا، ہڈیوں کا ایک بھورا اور خاکی ڈھانچہ تھا کہ بستر پر پڑا تھا۔

پلنگ کی پٹی سے لگا ہوا آئینے کے بغیر ایک پرانا سنگار میز تھا جس پر شراب کی بے شمار چھوٹی بڑی بوتلیں، کچھ اوندھی کچھ سیدھی، بکھری پڑی تھیں۔ کمرے میں ایک ہی الماری تھی جس کے دونوں پٹ کھلے تھے۔ یہ الماری بھی شراب کی خالی بوتلوں سے بھری ہوئی تھی۔ بڑا کتا بروس، غسل خانے میں ڈیرہ ڈالے تھا، اور ڈبری یعنی مسز بروس اپنے تین چار نئے پلوں کے ساتھ لینگان کی میلی کچیلی رضائی میں گھسی ہوئی تھی۔ الماری کے اوپر سرہانے کی طرف حضرت مریم اور حضرت عیسیٰؑ کی دو بڑی تصویریں خاصے قیمتی چوکھٹوں میں آویزاں تھیں، چوکھٹوں کی آب و تاب مدت سے مکھیوں کی اُگلی ہوئی گندگی میں دب کر ختم ہو چکی تھی۔

مسٹر لینگان سو رہا تھا۔ گنگو نے جگانے کی کوشش کی تو بڑی مشکل سے بیدار ہوا معلوم ہوا کہ حضرت سو نہیں رہے تھے بلکہ شراب کی غنودگی میں دھت پڑے تھے اٹھا تو میری طرف دیکھنے سے بیشتر یا اگر اس نے مجھے کسی طرح دیکھ بھی لیا تھا، تو مجھ سے کلام کئے بغیر لیٹے لیٹے مسٹر لینگان نے میز کی طرف ہاتھ بڑھایا اور رم کی بوتل میں سے نصف کے برابر شیشے کا ایک گلاس بھر کے رسمی طور پر میری طرف دیکھا اور از راہ اخلاق و مہمان نوازی گلاس مجھے پیش کیا، مگر میری معذرت پر خود غٹا غٹ چڑھا گیا۔

مجھے یوں معلوم ہوا جیسے وہ مدتوں کا بیمار تھا۔ عمر پچاس یا پچاس سے کچھ ہی اوپر ہوگی مگر وہ ستر برس کا ایسا فرطوت نظر آتا تھا جس کے جسم و روح کو مسلسل بیماریوں نے چاٹ لیا ہو۔ میری رمی مزاج پرسی پر مسٹر لینگان نے اپنی دھنسی ہوئی نیم باز ویران و بے نور آنکھوں کو بھینچ لیا۔ اور زندگی کے فلسفے پر گفتگو چھیڑ دی۔

”بھائی۔ زندگی جیسے آتی جائے، قبول کرتے جاؤ۔ اس کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں زندگی.....“

”تو ان کمروں کے لئے مجھے کتنا کرایہ ادا کرنا ہوگا؟“ میں نے گفتگو کا رخ اصل معاملے کی طرف پھیرنے کی کوشش کی۔

”کرایہ؟“ اس نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولتے ہوئے کمال بے نیازی کے ساتھ کہا۔ ”کرایہ کچھ بھی نہیں۔ مجھے پیسے کی ضرورت نہیں۔ ہاں اگر آسانی سے رم کی کچھ بوتلیں مہیا کر دیا کریں تو مہربانی ہوگی مگر اس میں بھی کوئی جبر یا پابندی نہیں۔ اور اگر ان بوتلوں میں آپ بھی شریک ہوا کریں۔ تو مجھے بے حد خوشی ہوگی۔“

اور اس نے رم کا ایک نصف گلاس بھر کر خالی کر دیا۔“

”مسٹر لینگان“ میں نے جواب دیا۔ ”ان بوتلوں میں شرکت کی سعادت تو شاید میں حاصل نہ کر سکوں۔ البتہ آپ کو ہر ماہ رم کی تین بوتلیں پیش ضرور کر دیا کروں گا۔“

میں یہ کہہ کر اجازت لے کر آ گیا مگر دل میں دیر تک سوچتا رہا کہ آج کتنے عجیب و غریب آدمی سے ملاقات ہوگی ہے۔

ایک ہی مکان میں رہنے سہنے سے پھر تو مسٹر لینگان سے اکثر ملاقات رہنے لگی اور اس عجیب و غریب کردار کی زندگی کے بعض حیرت انگیز گوشے سامنے آنے لگے۔

اسے ساڑھے چار سو روپیہ ماہوار تنخواہ ملتی تھی، جس میں سے وہ میری تین بوتلوں کے علاوہ کوئی اڑھائی تین سو روپے کا رم پیتا تھا۔ لال جی کے ہاں اس کا کھاتہ کھلا تھا۔ گنگو ہر روز وہاں سے ایک بوتل لے آتا۔ پچاس روپے ہر مہینے وہ اپنے فائرمین کو دیتا کرتا کیونکہ اصل میں انجن وہی چلاتا تھا، مسٹر لینگان کا تو خود اس کے اپنے قول کے مطابق یہ حال تھا کہ رم کے نشے میں سگنل وغیرہ دیکھنا تو خیر بڑی باریکی کی بات تھی، اسے بعض اوقات سرے سے اسٹیشن کی عمارت بھی نظر نہ آتی۔ پچاس روپے گنگو کو، جس میں اس کی تنخواہ اور باورچی خانے کا خرچ سبھی کچھ شامل تھا اور حق یہ ہے کہ یہ بہت کافی رقم تھی کیونکہ اس کی روزانہ زندگی کے پروگرام میں کھانے کا کوئی خانہ ہی نہ تھا۔ وہ صرف پیتا تھا۔ گنگو نے بہت مجبور کیا تو کسی وقت تھوڑا سا دلیہ زہر مار کر لیا۔ بقیہ روپوں میں کتوں کا راتب چلتا تھا۔ کتوں سے اسے عشق تھا البتہ یہ ضرور فضول خرچی تھی کہ پچھلے ایک برس میں ڈیزی نے جتنے بچے دیئے تھے وہ سب جوں کے توں موجود تھے۔ کتوں کی تعداد دیکھ کر کبھی کبھی یہ گمان ہوتا کہ مسٹر لینگان کتوں کے کسی جزیرے میں آباد ہے۔ دو تکیے سے لگے بیٹھے ہیں دو پائینتی میں دبکے ہوئے ہیں۔ دو بغل میں ہمک رہے ہیں دو بستر کی چادر کھینچ کر کونے میں لے گئے ہیں —— اور ڈیزی تو خیر مستقلاً بستر میں سکونت رکھتی تھی۔

مسٹر لینگان کا دستور العمل یہ تھا کہ یا تو ڈیوٹی پر ہے، اور ڈیوٹی کا بھی یہ عالم کہ صدر دین فائرمین اسے تھام کر شیڈ میں لے گیا اور اسی طرح تھامے تھامے واپس چھوڑ گیا —— اور جب گھر پر ہے تو رم پی کر انٹا غفیل پڑا ہے۔ میں مسلسل آٹھ مہینے اس کی زندگی کو قریب سے دیکھتا رہا۔ اس نے اس مدت میں ایک مرتبہ بھی غسل نہیں کیا ہفتہ میں ایک مرتبہ شیو ضرور بنواتا تھا مگر وہ بھی کہیں باہر انجن میں ہی بنواتا تھا——

انجن ڈرائیوروں کے پاس ایک ٹول بکس ہوتا ہے جس میں انجن کے ضروری اوزار رکھے ہوتے ہیں۔ مسٹر لینیگان نے اس ضروری بکس کو بھی رم کی بوتلوں سے بھر رکھا تھا۔

کبھی کبھی میں مسٹر لینیگان کو سمجھانے بجھانے کی کوشش کرتا تو وہ کہا کرتا۔ آپ کہتے ہیں میں شراب چھوڑ دوں۔ مگر کیسے چھوڑ دوں؟ جس طرح آپ میرا مطلب ہے جہلم اور راولپنڈی کے لوگ خاندانی سپاہی ہوتے ہیں۔ اسی طرح میں خاندانی شرابی ہوں شراب پیتے ہوئے یہ میری تیسری پشت ہے۔ شراب میرے خون میں رچی ہوئی ہے۔ میرا دادا اور میرا باپ شراب ہی سے مرے تھے۔ میں بھی بڑی تیزی سے اپنے انجام کی طرف دوڑا جا رہا ہوں۔ مگر میں مجبور ہوں، اور میرے لئے اس سے بہتر ہے بھی کیا کہ میں بعجلت تمام اپنے آپ کو ختم کر لوں ——— اور وہ رم کے دو تین گلاس اوپر تلے خالی کر دیتا۔

پہلی ملاقات کے وقت بھی ہر چند وہ مشت استخواں سے زیادہ کچھ نہ تھا۔ مگر رفتہ رفتہ اس کی حالت زیادہ خراب ہونے لگی۔ اب ہلکا ہلکا بخار بھی رہنے لگا۔ کھانسی بھی لاحق ہو گئی۔ اور بلغم میں خون کے سرخ حاشیے بھی نظر آنے لگے۔ مگر وہ زندگی کا ہر غم غرق رم کئے جا رہا تھا۔

میں اس کی تنہائی اور بیماری کے خیال سے اکثر اس کے پاس جا بیٹھتا، اور ادھر ادھر کی باتوں سے اس کا دل بہلانے کی کوشش کرتا۔ ایک دن اس کی طبیعت ذرا زیادہ خراب تھی میں نے پھر اسے ترک شراب کا مشورہ دیا۔ اور اس نے پھر وہی اپنا پرانا جواب دہرا دیا بلکہ آج اس نے اپنے جواب پہ کچھ اضافہ کرتے ہوئے کہا:

"خواہشات کا احترام کرنا میری زندگی کا سب سے بڑا اصول ہے۔ آپ آئے میں نے رم پیش کی۔ آپ نے انکار کیا۔ میں نے مزید اصرار نہیں کیا۔"

"یہ کتے بستر تو بستر، میرے صندوق میں سے کپڑے تک کھینچ کر لے جاتے ہیں بس ان کا دل بھی آزردہ نہیں کرنا۔"

"میز پر رکھے ہوئے شکر دان کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا: بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ شکر پھانکنے کو جی چاہتا ہے۔ میں شکر دان کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے شکر دان کو میری یہ حرکت ناگوار گزر رہی ہے جیسے وہ کہہ رہا ہو: "شکر مت پھانکو مجھے تکلیف ہو گی ——— اور میں فوراً اپنا ہاتھ کھینچ لیتا ہوں۔" ——— اور پھر رم کا ایک گلاس بھرتے ہوئے۔

"ہاں البتہ صرف یہ ایک ایسی چیز ہے جو میری طرف دیکھ کر، میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکراتی ہے۔ خوش ہوتی ہے۔ میرا استقبال کرتی ہے۔"

——— اور رم کا وہ گلاس اس نے یکبارگی اپنے حلق میں انڈیل دیا ایک روز از راہ مشورہ میں نے مسٹر لینگان سے کہا: "میری قطعی رائے ہے کہ آپ پھر شادی کر لیں آپ کی موجودہ زندگی نہایت بے مقصد اور اندوہناک ہے، آپ کو ایک ساتھی کی سخت ضرورت ہے۔"

"شادی!" ——— "شادی میں نہیں کر سکتا۔" مسٹر لینگان اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"میں اس موضوع پر اکثر سوچ چکا ہوں۔ میں خود چاہتا ہوں کہ کوئی میری دیکھ بھال کرے مگر شادی کا سودا بہت مہنگا معلوم ہوتا ہے، شادی کے نام سے مجھے اپنی مرحوم بیوی یاد آجاتی ہے جو ایک ماہ بیمار اور ایک ماہ تندرست رہتی تھی، ہر مہینے ایک سو روپے اس کی بیماری پر اٹھتے تھے۔ بچوں کا جھنجھٹ الگ۔ اب میں مزے سے رم پیتا ہوں، خیر اس وقت تو چلو مجھے عورت کے جسم کی ضرورت تھی۔ اب تو ایسی کوئی

ضرورت بھی نہیں۔ پھر میں کس لئے گھر میں عورت لاکر شراب کو گھر سے نکال دوں میرے نزدیک تو جنوبی افریقہ کی تیز رم کی ایک بوتل بلکہ اس بوتل کا ایک پیگ ایک عورت سے کہیں بہتر ہے۔"

اور وہ کالی کالی بدبودار افریقی رم کا ایک گلاس غٹاک سے پی گیا۔

ایک دن مسٹر لینگان بہت زیادہ پی گیا۔ گنگو اور میں اس کے پاس بیٹھے تھے اس کی طبیعت ذرا سنبھلی تو گنگو نے کمال قلق و تاسف کے ساتھ پوچھا۔

"صاحب! اس طرح کب تک جینا ہوگا؟"

"مگر جینا چاہتا ہی کون ہے بڈھے"، وہ گنگو کو اسی نام سے پکارا کرتا تھا "میں تو دراصل مرنا چاہتا ہوں، البتہ خودکشی نہیں کر سکتا کہ اس سے قدرت کی دل آزاری ہوتی ہے"

اتنے میں غسل خانے میں لیٹے ہوئے بروس کو نہ جانے کس بات پر غصہ آ گیا کہ زور سے عف عف شروع کر دی۔ ڈیزی کے دو چار ہوشمند پلے جو گھبرا کر بھاگے تو مسٹر لینگان کے لحاف میں آ گھسے اور استر کے شگافوں میں سے ڈھیر سی روئی گھسیٹ کر نالی میں لے گئے۔ ایک دوسرا پلا دھم سے ٹھیک مسٹر لینگان کے منہ پر آ گرا اور اپنی تر بتر زبان اس کے منہ میں ڈال کر گھمانے لگا۔

اور مسٹر لینگان نے اس تمام ماجرے میں اُف تک نہ کی۔ واقعی وہ کسی کی دل آزاری نہ کرنا چاہتا تھا۔

ایک مرتبہ میرے سامنے گنگو نے جو انگریزوں کی خدمت کرتے کرتے انگریزوں سے زیادہ ولایت کی زندگی کا قائل و معترف تھا۔ ولایت چلے جانے کی تجویز پیش

کی، مگر مسٹر لینیگان نے اس مشورے کو بھی بڑی سختی سے رد کر دیا۔ کہنے لگا۔ ولایت کا میرے سامنے نام ہی مت لیا کرو، لندن تو لندن، میں تو کراچی بھی جانے کو تیار نہیں ہوں (رم کا گلاس پی کر) مجھے ان لوگوں پر سخت حیرت ہوتی ہے جو لندن دوڑے جاتے ہیں۔ کیا یہ لوگ چاہتے ہیں کہ دنیا کی ساری آبادی ایک نقطے پر سمٹ کر آجائے تا آنکہ یہ صورت پیدا ہو جائے کہ نہ کسی کو کھانے کے لئے روٹی ملے، نہ سر چھپانے کو چھت ——— (رم کا ایک اور نصف گلاس خالی کرتے ہوئے) بڈھے! میری عشرت کی معراج پی کر سو رہنا ہے۔ لندن میں مجھے یہ عشرت کیسے نصیب ہو سکتی ہے۔ وہاں مجھے رم کون لا کر دے گا؟ وہاں تو مجھے اپنی چائے اور توس بھی خود تیار کرنے پڑیں گے اور میں اس طرح اپنی عشرت کو غارت نہیں کر سکتا۔ مجھے اگر چائے توس ہی تیار کرنے ہیں تو میں شادی ہی نہ کر لوں؟ مگر میں تو اپنی سرخوشی کو کسی قیمت پر اور کسی طرح بھی آلودہ نہیں کرنا چاہتا۔" ——— اور اس نے رم کا نصف بھرا ہوا ایک گلاس اپنے کانپتے ہاتھوں میں تھام لیا۔

غالباً فروری کا پہلا ہفتہ تھا۔ رات کا سماں، غضب کا جاڑا، آسمان پر گرے شرابور بادل چھائے ہوئے تھے۔ شمال کی طرف پہاڑ کی چوٹیوں پر کوندنے کی لکیریں ابھر ابھر کر ڈوب رہی تھیں، ریلوے کالونی پر ایک مہیب تہ در تہ تاریکی مسلط تھی ہم لوگ سرِ شام ہی بستروں میں دبک گئے تھے۔ مسٹر لینیگان کے کمرے سے اس کے کھانسنے کھنکارنے کی آوازیں کبھی کبھی آجاتی تھیں۔ یا وقفوں کے بعد بوڑھے بروس کی غضب ناک عف عف فضا میں گونج جاتی تھی۔

کوئی دو بجے کا عمل ہوگا۔ ناگاہ گنگو نے میرے دروازے پر دستک دی اور مجھے

پکارا۔ میں ہڑبڑا کر اٹھا۔ دروازہ کھولا۔" پوچھا کیا بات ہے۔ گنگو؟"

"صاحب کو کچھ ہو گیا ہے۔ ذرا دیکھئے تو۔"

ایک لمحہ ضائع کئے بغیر ہم جلدی سے کمرے میں پہنچے۔ لینگان بے سدھ پڑا تھا میں نے دل اور نبض ٹٹولنے کی کوشش کی۔ مگر مجھے زندگی کی حرکت و حرارت کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔ لیکن دل لینگان کی موت کو تسلیم نہ کرتا تھا۔ اتنا بے ضرر مرنجان مرنج آدمی اور مر جائے؟ ناممکن —— ناممکن —— اتنے میں گنگو —— سانجھ کے بنگلوں سے رحیم بخش گارڈ، غلام رسول اے۔ ٹی۔ او۔ اور رحمت اللہ کیرج انسپکٹر کو بھی جگا لایا۔ اطلاع ملنے پر تھوڑی دیر میں ریلوے ہسپتال کے ڈاکٹر ہاشمی بھی ربڑ کی نالی سنبھالے آ پہنچے۔ مگر مسٹر لینگان، ڈاکٹروں، دواؤں اور انسانی سعی و چارہ گری کی دسترس سے بہت دور جا چکا تھا۔ بہت دُور!

اس کے بوڑھے، زور، نحیف چہرے پر ایک عجیب سکون و اطمینان کا سایہ چمک رہا۔ بروس پلنگ کے اردگرد، دم ہلاتا پھر رہا تھا۔ بے تاب و پریشان ڈیزی ہم میں سے ایک ایک کے پاؤں چاٹ رہی تھی۔ اداس اور خاموش پلے ایک کونے میں جا دبکے تھے۔ اور میز پر افریقی رَم سے نصف بھرا ہوا شیشے کا ایک گلاس چمک رہا تھا۔

خطبۂ صدارت

جو غلط فہمی میں لکھا گیا

برادر صدر جسٹس محمد گل صاحب!

محترم حکیم محمد سعید صاحب، بانئ ہمدرد، اور

معززِ مقررین و باحثین و سامعین گول میز کانفرنس!

آپ بجا طور پر سمجھ رہے ہوں گے کہ میں اس گول میز کانفرنس میں ایک مقرر کی حیثیت سے تقریر کروں گا، میں اس کے برعکس، بجا طور پر، خطبہ صدارت لکھ کر لایا ہوں اس استحقاق، اتفاق یا استحصال کی تفصیل عرض کرتا ہوں:

میں نے کہیں پڑھا تھا کہ سالمن مچھلی سالہا سال گہرے سمندروں میں، خوار خجل، ہونے کے بعد آخر اسی دریا کے دہانے میں چلی جاتی ہے جہاں اس کے بزرگ انڈے دیتے تھے۔ ہم بھی تقریباً چالیس برس کی دفتری زندگی کے سمندر سے نکل کر ستمبر (۱۹۸۲ء) کے اواخر میں ضلع جہلم میں اپنے دریا کے دہانے (یعنی اپنے گاؤں) چلے گئے۔ اسی اثنا میں حکیم محمد سعید صاحب نے، غالباً ٹرانٹو کینیڈا سے ہمیں آج کی گول میز کانفرنس میں شرکت کے بارے میں خط لکھا جو ہمیں آج تک نہیں ملا، کیونکہ ہمارے ہاں کے اکثر گاؤں جغرافیے کے علاوہ تاریخ سے بھی نکل جاتے ہیں۔ اتنے میں ادھر جب گول میز کے بچھنے کی ساعت قریب آگئی تو راولپنڈی سے "ہمدرد فاؤنڈیشن" کے وائسرائے، جناب عبدالستار کا گرامی نامہ موصول ہوا کہ آپ گول میز، میں، باحث، کی حیثیت سے نامزد ہو چکے ہیں۔ ہم

نے بوا ایسی ڈاک جواب دیا: "حاضر سائیں!"

گول میز کانفرنس میں شرکت کا خالص لطف تو اس صورت میں آتا جس صورت میں لندن کی ۱۹۳۲ء کی ولایتی گول میز کانفرنس میں ہمارے ضلع کے دو اکابرین کرنل سر شیر محمد خان اور نواب سر مہر شاہ نے شرکت کی تھی یا جس طرح بعض ممبر آج کل مجلس شوریٰ میں شرکت کرتے ہیں، یعنی ع

ساری ہستی بج رہی ہے اور وہ خاموش ہیں

سچی بات یہ ہے کہ کانفرنس میں اپنی متکلم شرکت کے ضمن میں ہم اپنے آپ کو آپ کے لئے بمشکل ناقابل برداشت اور خود کو ناقابل شناخت سمجھتے تھے اور قریب تھا کہ نامۂ معذرت لکھ بھیجتے کہ اپنے لالہ مصری خان بحر، منشی فاضل، ادیب عالم حکیم حاذق تشریف لے آئے۔ انہوں نے پہلے ہمارا حوصلہ اور پھر ہمارے ہاتھ مضبوط کئے۔

فرمایا: "اللہ نے تمہیں دونوں جہانوں کا بار اٹھانے کے لئے پیدا کیا تھا۔ تم اتنی سی ذمہ داری پر بوکھلا گئے۔ ہم نے ملک میں آج تک باحثین کے سوا پیدا ہی کیا کیا ہے؟ جبھی تو پہلے سات برسوں میں آئین نہ بن پایا۔ جو آئین بن سکا، وہ بھی ان دنوں باحثین کے نرغے میں ہے۔ کیا تم دوسرے کے بولے ہوئے پر ایک آدھ گرہ بھی نہیں لگا سکتے؟ شکر کرو حکیم صاحب نے تمہیں کہیں مقررین میں نہیں دھر لیا!"

ہم نے بھی اب جو مزید غور کیا تو ستاروں کی گردش چنداں دگرگوں معلوم نہ ہوتی علمی مذاکرے میں باحثین کی کچھ ویسی ہی پوزیشن لگی جیسی جنگ میں تعلقات عامہ کے کپتانوں کی ہوتی تھی۔ محاذ جنگ پر موجود، میدان جنگ سے باہر، چنانچہ ہم گول میز کانفرنس کے تمام مدوجزر سے نچنت ہو کر باجرے کی کھڑی فصلوں میں بیٹھے ہوئے

بٹیروں میں جال پھینکتے رہے ع

یزداں بہ کمند آور اے ہمت مردانہ

اس عالم بے فکری میں ایک روز اسلام آباد سے ہمارے پڑوسی ٹھیکیدار صاحب کے فرزند ارجمند کا، جو ساتویں جماعت میں پڑھتا ہے، ہمارے نام گاؤں میں ایک جنگی (ایس او ایس) پیغام موصول ہوا کہ آپ ۱۵ ر اکتوبر کو گول میز کانفرنس کی صدارت کریں گے۔ پس منظر یہ تھا کہ ان ٹھیکیدار صاحب کا ٹیلی فون آج کل عملاً ہمارے پیغامات میں جُتا رہتا ہے۔ اب ہمدرد فاؤنڈیشن سے جن صاحب نے پیغام دیا، انہوں نے پیغام کا لُبِ لباب کوثر و تسنیم میں دھلی ہوئی اردو میں کچھ زیادہ ہی گھول دیا تھا۔ ادھر ہمارے محسن و مربی ٹھیکیدار صاحب کے گھر کے جملہ — بندہ و صاحب و محتاج و غنی — علاقہ پچھ کی ٹھیٹھ چھچھلتی ہوئی بولی کے سوا اور کوئی بولی نہیں سمجھتے۔ سو، وہ ان کے پیغام زبانی کا ملبہ اٹھا کر، اپنے اگلے پڑوسی میجر عبد القدوس صاحب کے پاس لے گئے۔ جواہر کی قدر جوہری اور فوجی کا مرتبہ فوجی سے پوچھیئے۔ میجر قدوس نے محدود و مبہم معلومات (انٹیلی جنس) کی روشنی (بلکہ اندھیرے میں) جناب عبد الستار کو، ڈی کوڈ، کیا تو وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ مجھ ایسا، تمغہ یافتہ سپاہی، جو ان سے دو بالشت سینئر بھی تھا، کسی مجلس میں صدر سے کم کیا کسی کرسی پر بیٹھے گا۔

اتنی اہم تقریب کے لئے اپنی، بائی لیٹرل صدارت، کا یہ مژدہ ہمارے لئے بیحد اچانک، غیر متوقع، مگر بے انتہا باعث مسرت تھا۔ سچی بات یہ ہے کہ اس خوشخبری سے ہم پر وہی کیفیت طاری ہوئی جو بعض حالتوں میں بعض افسانوی شہزادوں پر طاری ہوتی رہی ہے۔ ہم پہلے ہنسے، پھر روتے ہنسے کہ ہمیں صدارت کے شایان شان بھا

گیا۔ روئیے کہ صدارت ہم تک آ گئی۔ دل بلیوں کس طرح اچھلتا ہے؟ یہ تماشائے حیات وہوس ہم نے پہلی مرتبہ اس شدت سے اسی روز اپنے اندر برپا دیکھا۔ جذبات کی ہلچل میں یوں لگ رہا تھا جیسے صبح وشام کے دونوں وقت بغل گیر ہو گئے ہوں — کمال جنوں کی تابش میں جب اپنا مستقبل چمکتا نظر آتا تو نہایت اندیشہ کے ملگجے میں شام ہمدرد تاریکی میں ڈوبنے لگتی۔ یہاں ایک مرتبہ پھر لالہ مصری خان نے ہماری رات کو مہتاب سے محروم نہ ہونے دیا، بلکہ اپنے ایک جملے میں گویا ایک ایک ماہ تمام، ہمارے پیمانہ جاں میں انڈیلتے چلے گئے۔ فرمایا: عزیزمن! آئی ہوئی کرسی کو زنہار اگر کبھی ٹھکراؤ! اس ملک میں آدمی اگر کرسی پر نہیں ہوتا تو کسمپرسی میں ہوتا ہے دنیا کے تیور نہیں دیکھ رہے۔ اندریں حالات انسان کو ہر قسم کی ایمرجنسی کے لئے ہر وقت تیار رہنا چاہیئے۔ مجھے تو ایسا نظر آتا ہے کہ اگر تم برس دو برس اور زندہ رہ گئے تو قومی سطح کی صدارتوں کا دروازہ بھی تم پر کھل جائے گا ؏

یہ جہاں چیز ہے کیا لوح وقلم تیرے ہیں

"پھر یہ دیکھو" — لالہ مصری خان اس ولولے سے بولے جا رہے تھے، جیسے مجھ کو میرا خطبۂ صدارت املا کرا رہے ہوں" ہاں تو پھر یہ دیکھو کہ گلاس کے پانی کے سوا جلسے کی صدارت سے زیادہ آسان کوئی اور چیز جلسے میں نہیں ہوتی۔ صدر بولتا ہے تو بیچ میں کوئی بول نہیں سکتا۔ نہ بولنا چاہے تو اسے کوئی بلوا نہیں سکتا۔ تم چاہو تو شفیق الرحمٰن یا کرنل محمد خان کے مانند خاموش صدارت کر لیا کرو۔ موٹے آدمی سے کچھ لوگ ایسی زیادہ توقعات بھی نہیں رکھتے۔"

ہم نے پہلے تو اپنی استعداد اور بیرونی فساد کے خدشے سے خاموش صدارت ہی کا

فیصلہ کیا مگر پھر یہ سوچ کر کہ ع

یہ طور کا جلوہ ہے ہر بار نہیں ہوتا

خطبۂ صدارت لکھ لیا۔

صدر مجلس کے طور پر محترم جناب جسٹس قاضی گل صاحب کا اسم گرامی اور مقررین کی فہرست میں اپنا نام میں نے آج ہی طبع شدہ دعوت نامے میں دیکھا۔ جج صاحب کا نام دیکھ کر ہمارے ہاتھوں کے طوطے تو ضرور اڑے، مگر دل خوش بھی ہوا کہ ان کی صدارت علم اور قانون کی بالادستی کی علامت ہے۔ یوں بھی جہلم کی سکنی نسبت سے وہ ہمارے گرائیں ٹھہرے، گویا صدارت ذرا اونچی چلی گئی ہے، گھر سے باہر نہیں گئی، مگر اس کے یہ معنی بھی نہیں کہ ہم خطبۂ صدارت چھوڑ کر تقریر کرنے لگ جائیں۔ خطبۂ صدارت اور تقریر کے فرق سے آپ یقیناً آگاہ ہوں گے۔ نہیں ہیں تو اب ہو جائیں گے۔ مقرر مشورہ دیتا ہے صدر فیصلہ صادر کرتا ہے۔ مقررین کے ہاں عمومیت ہوتی ہے، صدر کے یہاں قطعیت تو لیجئے یہاں ہمارا خطبہ صدارت شروع ہوتا ہے:

محترم حکیم صاحب! معزز خواتین وحضرات!

میرا سب سے پہلا اور سب سے خوشگوار فرق یہ ہے کہ میں اس انتہائی اہم علمی مذاکرے کی صدارت کے اعزاز کے لئے محترم حکیم صاحب قبلہ کی خدمت میں اپنے تشکر سپاس وغیرہ کے جذبات کا ہدیہ پیش کروں۔ یہ نذرانہ میں خاموشی کی صورت میں پیش کروں گا۔ کیونکہ داناؤں نے کہا ہے:

"بھیڑے رون توں چپ رہنا چنگا" (برے رونے سے چپ رہنا اولیٰ) صدر کی حیثیت سے اپنے بارے میں بھی ہم اپنے اکثر پیش رووں کے ارشادات کا اعادہ کریں

گئے کہ "من آنم کہ من دانم۔ بلکہ وہ بزرگوار تو فکر و فن میں ہم سے بدرجہا بلند مقام و مرتبہ رکھتے تھے۔ ہمیں تو دراصل یہی معلوم نہیں کہ ہم کتنے پانی میں ہیں۔ یہ معلوم ہوتا تو ہم گول میز کانفرنس کی صدارت کیوں قبول کرتے؟ صدارت قبول کر لی تھی تو خطبۂ صدارت لکھنے کی جسارت نہ کرتے۔ اب تو ہم حکیم صاحب کا شکریہ ادا کر چکے ہیں، ورنہ ان سے شکایت کرتے کہ ع

ہوئے تم دوست جس کے دشمن اسکا آسماں کیوں ہو

مگر کیا کیجئے کہ ہم اپنی وضع کو بدل نہیں سکتے۔ ہماری عادت ہے کہ ہم اپنی کہی ہوئی بات پر خواہ عمل کریں یا نہ کریں، مگر اسے کبھی واپس نہیں لیتے۔ ملک چھوٹا ہو سکتا ہے بات چھوٹی نہیں ہو سکتی۔ بات یہ ہے کہ اگر ہم اپنی غلطیوں کو اسی فراخ دلی سے تسلیم کرنے لگیں تو ہمارے پاس رہ کیا جائے گا، موٹاپے اور بڑھاپے کے سوا؟

ویسے ہم بہت خوش ہیں کہ ہماری صدارت کی افواہ پھیل سکتی ہے اور ہمارے ہاں کسی افواہ کے حقیقت بننے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے!

آئیے! اب موضوع زیر بحث کی طرف چلتے ہیں۔ مگر موضوع کی طرف منہ کرنے سے پیشتر ایک اور معذرت بھی ضروری ہے، وہ یہ کہ ہم طبعاً ایسے علمی اور تحقیقی موضوعات سے جن میں کتابوں اور حوالوں کی ضرورت پڑتی ہو، سخت گھبراتے ہیں۔ ہم ادب کے سکالر نہیں، ادب کے باؤلر ہیں تجزیاتی غلام گردشوں میں اترتے ہوئے یوں لگتا ہے جیسے عظمت کو مسرت کی قیمت پر اور مسرت کو صحت کی قیمت پر خرید رہے ہیں۔

ہمیں احساس ہے کہ پس منظر قدرے کھنچ گیا ہے، مگر آپ تسلی رکھیں کہ پس منظر کے ساتھ مضمون کی طنابیں بھی کھنچ گئی ہیں، بلکہ سرے سے اکھڑ گئی ہیں۔ عادتاً

بھی ہمیں جتنا پیچھے نظر آتا ہے، اتنا آگے نظر نہیں آتا۔ ایک بات ضمناً یہ بھی عرض کر دیں کہ چونکہ ہم پہلی مرتبہ صدارت کر رہے ہیں، اس لئے ہمیں کچھ اندازہ نہیں کہ ہمیں خطبۂ صدارت کتنے وقت میں ختم کرنا چاہیئے۔ سردست تو ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ میں، یعنی ہم خطبۂ صدارت کے ہاتھ میں ہیں اور آپ ہمارے ہاتھ میں —— یہ الگ بات کہ ع

سکندر جب گیا دنیا سے دونوں ہاتھ خالی تھے

حکیم صاحب کی ایک ذاتی خوبی یہ بھی ہے کہ وہ بات میٹھی کرتے ہیں، اُردو سلیس لکھتے ہیں، مگر سوال مشکل پوچھتے ہیں۔ آج کے سوال کا مغز، جو ہم نے فاضل مقالہ نگاروں کے مقالات سے کشید کیا ہے، یہ ہے :

"پاکستان میں شعر و ادب کا کیا مقام ہے اور اس نے پاکستان کی تعمیر میں، تہذیب و تمدن میں کس قدر اور کس انداز سے حصہ لیا ہے، اور اس اثر اندازی اور اثر پذیری سے کیا نتائج برآمد ہوتے ہیں؟"

اجازت دیجیئے کہ اس عمل پر ہم ادب کے وظیفے اور لطیفے کے بارے میں کچھ سنی سنائی باتیں آپ کو بھی سناتے چلیں تاکہ آگے چل کر (بہت آگے بھی نہیں) اس سوال کا جواب تلاش کرنے میں کچھ مدد مل سکے یا انشاء اللہ کچھ دھند پھیل سکے۔

آرٹ کا سوال ریاضی کا سوال نہیں کہ کوئی قطعی جواب دیا جا سکے۔ مجلس شوریٰ اور مجلس شعر میں بڑا فرق ہے۔ ادب، زندگی کو بیک وقت کئی زاویوں، کئی سطحوں سے دیکھتا ہے۔ ادب، بلدیہ کے ممبروں کی طرح لوگوں کی بہت سی توقعات پوری کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ توقعات بھی باہم متضاد اور متصادم۔ قوی و کمزور۔ قاہر و کریم —— سچا ادب

حقیقت کے برعکس نہیں ہوتا۔ مگر حقیقت اور صداقت کے درمیان بھی تو کچھ پردے حائل رہتے ہیں ع

خدا کے نام کا پردہ خدا کا نام نہیں

کفر کھینچتا ہے، ایمان روکتا ہے۔ پولیس پکڑتی ہے کبھی آسودگی مقدم کبھی ہدایت اوّل۔ پیار بھی ضروری، تفریح بھی لازمی۔ مقصدیت، ایک ضرورت بھی ایک رکاوٹ بھی جو ادب لکھا جاتا ہے وہ اس ادب سے بہت کم ہے جو نہیں لکھا جاتا۔ ادب میں سبق تو ہوتا ہے، مگر نتیجہ نہیں نکلتا۔ نکلتا بھی ہے تو مدت مدید کے بعد — اقبال نے تو شاعری کو سازِ درویشی، کہا ہے۔ جس کا حاصل نہ پُوچھ!

ہم اپنی توجہ سوال کے پہلے حصے پر مرکوز کر رہے ہیں، وہ یہ کہ پاکستان میں شعر وادب کا مقام کیا ہے؟

طویل جواب کی گنجائش ہم تمہید میں کھا چکے، مختصر جواب یہ ہے کہ:

جس ملک میں پرائمری تعلیم سمیت خواندگی کی شرح بیس فی صد سے زیادہ نہ ہو۔

جہاں ادبی کتاب بمشکل ایک ہزار کی تعداد میں چھپی ہو۔ بکتی اس سے بھی کم ہو اور پڑھی اس سے بھی کم جاتی ہے۔

جہاں کتاب اور قمیض کی قیمت تقریباً برابر ہو، چنانچہ قمیص پہنے بغیر اور کتاب پڑھے بغیر پھٹ جاتی ہو۔

جو لوگ کتابوں کے شائق ہیں وہ روٹی نہیں خرید سکتے۔ جو کتاب خرید سکتے ہیں وہ "وی سی آر"۔ ڈی پی آر۔ سی بی آر، خریدتے ہیں۔

جہاں، جو لوگ کام کر سکتے ہیں وہ کام کرتے نہیں، اور جو نہیں کر سکتے وہ کرتے

ہیں۔

جہاں، کبھی سیاسی استحکام کے باعث اور کبھی سیاسی عدم استحکام کی وجہ سے شہری آزادیاں متزلزل و معطل رہتی ہوں۔ خواتین و حضرات!

اس معاشرے میں شعر و ادب کا کیا مقام ہو سکتا ہے؟ مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ ادب کی اثر اندازی یا اثر پذیری کا عمل رُک گیا ہو۔ ادب قید مقام سے آزاد ہے۔ یہ رہ گزر کی چیز ہے۔ ادب پانی کی طرح اپنا راستہ خود بناتا ہے۔ لوگوں کو اس کا پتہ اسی وقت چلتا ہے جب پانی سر سے اونچا ہو جاتا ہے۔ عصری ادب میں اثر اندازی کا عمل جاری ہی نہیں ہے، ہم تو اس کی رفتار کو حوصلہ افزا کہیں گے۔ وہ وسائل کے بغیر بھی مسائل سے نبرد آزما ہے، البتہ اس کے نتائج دست بدست نہیں، تاہم بعض عوامل دیوار پر لکھے نظر آتے ہیں، مثلاً:

۱۔ پاکستان کا عصری ادب اپنے ملک کے حالات و کوائف کا بھرپور شعور رکھتا ہے اور اس کے اظہار میں وہ غالب کا طرف دار کبھی نہیں رہا۔ اس نے حیات، حرکت انقلاب احتساب، حسن اور خیر کی ترجمانی کی ہے، مستثنیات کب اور کہاں نہیں ہوتے؟ لیکن مجموعی طور پر پاکستانی ادب ایک محب وطن حزب اختلاف کا رول ادا کرتا ہے ع

کبھی آ کے منظر عام پر، کبھی ہٹ کے منظر عام سے

۲۔ وہ جہاں اپنے گرد و پیش سے غافل نہیں، وہاں دنیا بھر کے مظلوم و محکوم انسانوں کی دھڑکن بھی اس کی آوازیں برابر سناتی دیتی ہے۔ کبھی تو یہ شور کھٹکنے لگتا ہے کہ جیسے پیار کی باتیں کم ہوتی جا رہی ہوں اور آدمی سوچنے لگے کیا انسانی زندگی

عشق و محبت کے بغیر بھی آسودہ و بامعنی ہو سکتی ہے ؟

سیاسی عدم استحکام اور مجلسی گھٹن کی طرف ہم اشارہ کر چکے ہیں۔ اس پر ایک واقعہ یاد آگیا۔ نپولین سے کسی شخص نے شکایت کی کہ فرانس میں اچھا ادب پیدا نہیں ہو رہا۔

نپولین نے جواب دیا: "میں اپنے وزیر داخلہ سے پوچھوں گا۔"

ہم بھی کسی وقت یہ سوال اپنے وزیر داخلہ سے پوچھیں گے ــــــ فرصت، کشاکش غم ہستی سے گر ملی!

ڈاکٹر اعظم کریوی کے ساتھ دو سال

آخری دو خاکے تخیلی نہیں حقیقی ہیں ــــــ
اپنے دو شفیق اور پیارے بزرگوں کی یاد میں چند تاثرات!

مولانا چراغ حسن حسرت مرحوم کا تذکرہ لکھنے میں میرے عزیز دوست اور مولانا کے چہیتے شاگرد میجر مسعود احمد نے میرا ہاتھ بٹایا ہے۔ (ض)

ابوالاثر حفیظ جالندھری میرے اس احسان کو کبھی نہیں بھولتے کہ میں نے انہیں پنجاب کی ایک محترم و بزرگ شخصیت راجہ فاضل محمد خان مرحوم سے متعارف کرایا تھا۔ میں حفیظ صاحب کے اس احسان کو نہیں بھول سکتا کہ انہوں نے مجھے ڈاکٹر اعظم کریوی سے ملایا۔

میں اس پود سے ہوں جس کا بچپن ڈاکٹر اعظم کریوی کی کہانیوں کا شباب تھا ہوش کی آنکھیں کھلیں تو منشی پریم چند کے بعد ڈاکٹر اعظم کریوی کو افسانہ نگاری کے منظر پر چھائے ہوئے دیکھا۔ ہم دیہات والوں کو ان کی کہانیاں اپنی کہانیاں معلوم ہوتی تھیں۔ ان کے لکھنے کا انداز سادہ۔ رسیلا اور دل نشین تھا۔ مگر بہت بعد میں — جب ادب ہی کے واسطے سے ادب کے مشاہیر سے خود میری ملاقاتوں کا موقع آیا تو ڈاکٹر اعظم کریوی کا کوئی سراغ نہ ملتا تھا۔ مجھے کوئی ایسا شخص بھی نہ مل سکا جو

انہیں ذاتی طور پر جانتا ہو۔ رفتہ رفتہ باقی دنیا کی طرح میں بھی انہیں بھول گیا یہ ستارہ ڈوب چکا تھا۔ ع

آسماں ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک

جناب حفیظ جالندھری ہر چوتھے پانچویں برس کسی نہ کسی سرکاری محکمے کے ڈائریکٹر مقرر ہو جاتے ہیں۔ جس کا خمیرہ وہ خود ہی اٹھاتے ہیں۔ ۱۹۵۱ء میں جب وزارت دفاع میں ان کو "ڈائریکٹر آف مورال" کا عہدہ پیش کیا گیا تو اپنے نائب کی حیثیت سے انہوں نے مجھے بھی طلب کر لیا۔ ڈاکٹر اعظم مرحوم سے میری ملاقات اسی محکمہ میں ہوئی اور پھر تقریباً دو برس تک ہم ایک دوسرے کی زندگی میں کچھ اس طرح داخل رہے کہ ان حالات اور اتنی مدت میں ایک دوسرے سے گہری محبت یا شدید نفرت کے علاوہ کوئی اور منطقی کیفیت ممکن ہی نہ تھی۔

محکمہ نیا نیا کھڑا ہوا تھا۔ بلکہ کہنا چاہیئے کہ ابھی بیٹھا ہوا تھا۔ ایک ڈائریکٹر حفیظ اور ایک ڈاکٹر (اعظم) اس کی کل کائنات تھے۔ دفتر ملیر چھاؤنی تھا۔ میرے لئے کراچی ملیر۔ محکمہ۔ دفتر سب اجنبی تھے۔ ملیر کے بارے میں الٹا یہ سن رکھا تھا کہ وہاں پہلی مرتبہ اپنے آپ کو کھوئے بغیر کوئی مقام پایا ہی نہیں جا سکتا۔ میں حفیظ صاحب کو اپنی آمد کی اطلاع تو دے چکا تھا۔ مگر "شاعروں کے محکمہ" سے مجھے یہ توقع ہرگز نہ تھی کہ اسٹیشن پر مجھے کوئی لینے بھی آئے گا۔ تردد بھی کیا گیا تو منہ اندھیرے ملیر کے کسی گوشے سے اٹھ کر بروقت کوئی اسٹیشن پر پہنچ بھی سکے گا؟ لیکن تڑکے کے سرمئی جاگتے ہوئے سے جھٹپٹے میں جب گاڑی ڈرگ روڈ پر رکی تو یہ دیکھ کر بڑی مسرت اور مسرت سے زیادہ حیرت ہوئی کہ حفیظ صاحب خود اسٹیشن پر موجود تھے۔ ان کے ساتھ ایک اور صاحب بھی تھے جو

صوبیدار کی فوجی وردی میں ملبوس تھے۔

یہ پلیٹ فارم پر معانقے کا عمل شروع ہوا تو حفیظ صاحب نے اپنے ساتھ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ——— "انہیں جانتے ہو، کون ہیں؟ ——— یہ ڈاکٹر اعظم کریوی ہیں۔ میری خوشی اور حیرت کی کوئی انتہا نہ تھی۔ مجھے ابھی تک یہ علم نہ تھا کہ ڈاکٹر صاحب اس نئے محکمہ میں ہمارے رفیق کار تھے۔ میں معانقہ کے لیے حفیظ صاحب کی طرف جاتے جاتے پلٹ کر ڈاکٹر اعظم کریوی سے لپٹ گیا۔

دفتر میں میرا اور ان کا بڑا گہرا سابقہ تھا۔ افسر اعلیٰ کی حیثیت سے حفیظ صاحب ہر چند جزئیات پر نگاہ رکھنے والے افسر ہیں، تاہم آخر ڈائریکٹر تھے۔ محکمے کو انتظامی لحاظ سے اٹھانا یا بٹھانا میرے اور ڈاکٹر صاحب کے سپرد تھا۔ چنانچہ ہم نے ڈائریکٹر صاحب کو ایک باعزت فاصلے پر سب سے بڑا کمرہ دے کر دو ہم بغلی کوٹھڑیوں میں اپنے اپنے دفتر اس صورت سے جما لیے کہ ایک دوسرے کی صورت ——— جب ذرا گردن اٹھائی دیکھ لی!

کچھ کام اس نوعیت کا تھا کہ عام دفتری ضوابط سے مختلف ضوابط وضع کیے بغیر محکمہ اپنی جگہ پر کھڑا تو رہ سکتا تھا، چل نہ سکتا تھا۔ نیا نیا محکمہ نئے مسائل، میں اور ڈاکٹر صاحب پہروں سر جوڑے بیٹھے رہتے۔ نتیجہ یہ کہ ہم دونوں بہت جلد ایک دوسرے کے بہت زیادہ قریب آ گئے۔ دفتر کے علاوہ دفتر سے باہر بھی اکثر یکجائی رہتی۔ ملیر میں یوں بھی ڈھب کی سوسائٹی کا قحط تھا۔ کچھ ہماری رہائش کی یہ صورت تھی کہ سلہٹ لائن کی جس سڑک کے ایک کنارے پر دفتر تھا، دوسرے بازو پر ٹھیک سامنے حفیظ صاحب کا بنگلہ تھا، درمیان میں ایک مکان چھوڑ کر میں رہتا تھا، اور بازار کی طرف چند قدم پر ڈاکٹر صاحب دفتر اور گھر اتنے قریب قریب ہوں تو رفتہ رفتہ دفتر اور گھر کا امتیاز

ہی اٹھ جاتا ہے۔ ہمارے دفتر کھولنے کا تو ایک وقت مقرر تھا مگر بند کرنے کا کوئی ٹھیک نہ تھا۔ بسا اوقات گھروں سے شام کا کھانا بھی وہیں منگوا لیا جاتا۔ دفتر سے اٹھتے تو حفیظ صاحب کے ہاں جا بیٹھتے۔ ظاہر ہے اس کیفیت میں ڈاکٹر صاحب سے بے تکلف ہوئے بغیر میرے لئے کوئی چارہ نہ تھا۔ سن و سال کے فرق کے باعث اگر میں ذرا سا فاصلہ قائم بھی رکھنا چاہتا تو وہ آگے بڑھ کر مجھے سینے سے لگا لیتے۔ حجاب و تکلف کے وہ سخت مخالف تھے۔ دفتر میں پہلے ہی روز وہ مجھ سے کہنے لگے ہیں تو آپ کو بھائی صاحب کہا کروں گا اور فی الحقیقت میرے ساتھ ان کا سلوک بڑے شفیق بھائی کا سا رہا۔ محکمانہ تعلقات بہت جلد دوستانہ محبت میں ڈھل گئے۔ ہم لوگ کسی مشترکہ دفتر کے کارکنان سے زیادہ ایک کنبے کے افراد معلوم ہوتے، دکھ سکھ کے شریک۔

ڈاکٹر اعظم کریوی کی شخصیت اور کردار کو میں اگر ایک لفظ میں بیان کرنا چاہوں تو وہ لفظ ہے ——— "حیرت انگیز" جب تک ان سے ملاقات نہ ہوئی تھی، میں انہیں سچ مچ کا ڈاکٹر سمجھتا تھا۔ ملاقات ہوئی تو پتہ چلا کہ وہ ڈاکٹر تھے ہی نہیں۔ تمام عمر فوج کی نوکری میں گزاری۔ وہ رسالدار اعظم کریوی تھے۔ وہ اسی طرح کے "ڈاکٹر اعظم" تھے جس طرح سکندر نام کا کوئی عام آدمی "سکندر اعظم" کہلانے لگ جائے ——— یہ تو خیر لطیفہ ہوا، لیکن ان کی زندگی کا جو بھی گوشہ سامنے آیا، حیرت انگیز پایا۔

وہ بڑے پائے کے ادیب تھے، مگر شکل و صورت کے علاوہ ان میں ادیبوں والی کوئی بات نہ تھی۔ خوبی نہ سہی، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ادیبوں، فن کاروں کی سرشت و طبیعت میں تھوڑی بہت کاہلی۔ بے پرواہی، بے قاعدگی، بے نیازی عموماً ضرور ہوتی ہے۔ یہ چیزیں کسی کے اوپر لگی ہوتی ہیں، کسی کے اندر بیٹھی ہوتی ہیں۔ مرحوم میں ایسی کوئی

چیز نظر نہ آتی تھی۔ کبھی تھی بھی تو اس کا گلا گھونٹ چکے تھے۔ یہاں تک کہ اب وہ ان سب چیزوں کی ضد بن چکے تھے۔ معمولات کے اتنے پابند تھے کہ اتنے پابند آدمی میں نے بہت کم دیکھے ہیں۔ احساس فرض کا جذبہ اس قدر شدید کہ ان کی زندگی ایک سزا بامشقت معلوم ہوتی۔ پاسبان عقل ہر وقت دل پر مسلط۔ رات کو خواہ کسی وقت سوئیں علی الصبح اٹھ بیٹھتے۔ آپ کوئی سا دن چن لیں، اگر بیمار نہیں ہیں تو صبح چھ بجے داتن کرتے ہوئے اور سات بجے کنجڑے کے ہاں گوبھی پالک خریدتے ہوئے ملتے۔

۱۹۵۱ء میں وہ پنشن کی حد پر جا پہنچے تھے۔ زندگی کچھ اس بے دردی سے ان کے اوپر سے گزر رہی تھی کہ وہ اپنی عمر سے بھی گویا پندرہ برس زیادہ معمر نظر آتے تھے، رخسار پچک گئے تھے۔ ہڈیاں ابھر آئی تھیں۔ دبلے پتلے، لاغر، کمزور، آنکھیں اندر کو کہیں اتنی دور چلی گئی تھیں کہ چہرے پر ناک ہی ناک رہ گئی تھی۔ مگر اس کے باوجود بلا کے مستعد، غضب کے چوکس اور چوبند۔ کارفرما و کارکشا۔ دیکھنے میں وہ تھکان کا مجسمہ دکھائی دیتے مگر تھکنا وہ جانتے ہی نہ تھے وہ اس مقام پر تھے جہاں تھکان خود تھک کر بیٹھ جاتی ہے۔

اس وقت ان کی (غالباً) تین بیویاں زندہ موجود تھیں جو تین الگ الگ گھروں میں رہتی تھیں۔ ایک لڑکانہ میں، دوسری مارٹن روڈ کے عقب میں، تیسری ناظم آباد میں یا شاید کسی دوسری بستی میں اور خود آپ بچوں کا "بچورا" سمیٹے ہوئے ملیر چھاؤنی میں۔ ایک پرانی ٹوٹی پھوٹی بائیسکل ان کے پاس تھی، اس پر سوار زمین کا گز بنے ادھر سے ادھر دوڑتے پھرتے۔ بارہا ایسا ہوا کہ ملیر سے رات کے گیارہ بجے اٹھے اور انتہائی

دل جمعی سے بائیسکل پر کراچی روانہ ہو گئے۔ پھر دوسری صبح ٹھیک وقت پہ دفتر میں موجود۔ گرمی ہو یا سردی ایک مسافت طے کرنے کے بعد دوسری منزل کی طرف چل پڑنے کے لئے انہیں اتنے وقفے سے زیادہ مہلت درکار نہ تھی کہ وہ ڈبیہ میں سے پان کا ٹکڑا نکال کر منہ میں رکھ سکیں۔ ان کی گھریلو زندگی کا پھیلاؤ ان کے وسائل کے بس کا روگ نہ تھا۔ معاملات الجھے ہوئے بھی تھے مگر یہ ناممکن تھا کہ محض ان کی کاہلی یا بے پرواہی کے سبب کوئی معاملہ الجھنے پائے یا دیر تک الجھا رہے۔ جس وقت ان کو جس مقام پہ ہونا چاہیئے وہ وہاں ضرور ہوتے۔ ان کی ٹیبل ڈائری کا ہر خانہ گھریلو اندراجات سے اٹا ہوتا۔ چھ تاریخ کو افتخار کی فیس، نو کو ببو امتحان، بارہ کو مارٹن روڈ پر لکڑی، پندرہ کو لاڑکانہ کا حساب، بیس کو بڑی بیگم کے گھی، چوبیس کو بچوں کو لے جانا وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب دھندے وہ اسی ٹوٹی ہوئی سائیکل پر انجام دے لیتے۔ انتظام خانہ داری میں ان کی مشق و مہارت کا یہ عالم تھا کہ ازراہ محبت میرے گھر کے بعض انتظامی امور بھی انہوں نے اپنے ہاتھ میں لے رکھے تھے۔

پھر جو مستعدی گھر کے دھندوں میں تھی اس سے سوا دفتری فرائض میں، وقت کے پابند۔ ڈیوٹی کے پکے۔ کام میں تیز۔ دفتر کا کام اس لگن سے کرتے جیسے گھر کا کام کر رہے ہوں۔ وہی سچا تردد۔ وہی بے اختیارانہ تشویش، وہی بے انداز مخلصانہ انہماک دفتر کا وقت ختم ہو چکا ہے۔ حفیظ صاحب آوازیں دے رہے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب آیئے دن بھر کی محنت کے بعد اب کچھ گپ شپ ہو جائے مگر ڈاکٹر صاحب ہیں کہ اب نئے سرے سے دفتر کھول کر بیٹھ گئے ہیں۔ بڑی سنجیدگی سے جواب دیتے ———

حضرت مجھے تو ابھی معذور ہی سمجھئے بہت کام بقایا پڑا ہے۔ آپ افسر سہی، محکمہ تو بھی

کو چلانا ہے؟ ـــــــ سامنے ٹیبل ڈائری کا خانہ چھوٹی بڑی بیگم درجنوں چھوٹے بڑے کاموں سے بھرا ہوتا۔ مگر وہ اس اطمینان سے بیٹھے رہتے جیسے ذہن میں کوئی خلفشار موجود ہی نہیں۔ حالانکہ بعد میں اسی شام کو دس گیارہ بجے انہیں اپنی ٹوٹی ہوئی بائیسکل پر ملیر سے کراچی جانا پڑتا۔

مزاج ایسا تھا کہ اس مزاج کا آدمی جہاں بھی مل جائے اسے اٹھا کر دفتر میں رکھ لینا چاہیئے۔ ملائم۔ متحمل۔ معاملہ فہم، معاملات پر اپنی ایک رائے بھی رکھتے موقع محل دیکھ کر اس کا اظہار بھی ضرور کرتے، مگر سب کچھ اس سلیقہ کے ساتھ کہ گویا اپنی کوئی رائے ہی نہیں۔ کوشش یہ ہوتی تھی کہ ڈائریکٹر صاحب ان کی رائے کو خود اپنی رائے سمجھ کر اس پر عمل کریں۔ وہ اپنے نقطہ نظر کو واشگاف الفاظ میں بیان نہیں کرتے تھے۔ افسر کو گھیر گھار کر اس تک لے آتے تھے۔ اپنے کام کی اہمیت، اس کی مقدار و معیار پر روشنی ڈالنے کا بھی وافر ملکہ تھا۔ کام نہ ہوتا تو پیدا بھی کر لیتے، حفیظ صاحب دفتری ڈرافٹوں میں شعر کی جامعیت کے قائل تھے، اور ڈاکٹر صاحب افسانوی پھیلاؤ کے۔ ان کی خواہش ہوتی کہ ڈرافٹ میرزا غالب کی غزل ہو، ان کی کوشش ہوتی کہ ڈرافٹ میں تمہید، پلاٹ مرکزی خیال، نقطۂ عروج سب کچھ ہو۔ نتیجہ یہ کہ کام پیدا ہوتا رہتا۔

مرحوم کو میں نے آرام سے فارغ بیٹھے کبھی نہ دیکھا۔ بعض اوقات گمان ہوتا کہ فارغ بیٹھنے سے انہیں شاید تکلیف ہوتی ہے۔ دفتر تو خیر دفتر تھا، گھر پر بھی ملے تو ہمیشہ مصروف ملے۔ کبھی چارپائی کا بان ادھیڑ رکھا ہے۔ کبھی دھوتی باندھے گھر کی صفائی میں جتے ہیں۔ کبھی نواسے نواسیوں کے حلقے میں بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ کچھ نہیں کر رہے ہیں تو بائیسکل پر چڑھے کسی طرف کو چلے ہی جا رہے ہیں۔ ان کی طبیعت میں عجیب بے چینی

ایک بیسا بیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ملیر سے ڈیوٹی ٹرک لے کر ہم لوگ جب کبھی کراچی جاتے، آپ اپنی سائیکل بھی اس میں رکھ لیتے۔ جہاں جہاں ٹرک نہ جاسکتا تھا۔ وہاں وہاں بائیسکل پر ہو آتے۔ بازار میں اچھے بھلے چلتے چلتے اچانک معذرت کر کے یکبارگی غائب ہو جاتے۔ پھر خدا معلوم کہاں کہاں کا چکر کاٹ کر ناگاہ کسی موڑ پر آن ملتے۔ ابھی تھے ابھی نہیں ہیں۔ آرام ان کی سرشت ہی میں نہ تھا۔ دوستوں کی بے تکلف صحبتوں میں ان کی گفتگو پر بھی مشقت کا گمان ہوتا۔

جن دنوں ان سے میری ملاقات ہوئی ہے، وہ آہستہ آہستہ مر رہے تھے۔ صحت کمزور، آمدنی قلیل، تین چار کنبوں کی کفالت، ان کا رنگ مرنے سے پیشتر ہی زرد ہو چکا تھا۔ جب تک فوج میں تھے بہت سی مراعات حاصل رہیں۔ فوج کے بعد خالی وہ ڈھائی سو روپے ماہوار کی آمدنی ان کے مختلف کنبوں کے حساب سے پچاس ساٹھ روپے ماہوار سے زیادہ معنی نہ رکھتی تھی۔ لباس، خوراک رہائش ہر چیز چوپٹ ہو گئی تھی۔ اپنی ذات پر وہ ایک کوڑی بھی نہ خرچ کرتے تھے۔ وہ دراصل اب اپنے لئے جی ہی نہیں رہے تھے۔ ان کی مثال تانگے کے ایک ایسے عمر رسیدہ، گرستہ، زخمی گھوڑے کی سی تھی۔ جو مالک کی روزی اور اپنے چارے کے چار تنکوں کے لئے دن بھر تانگہ کھینچنے پر مجبور ہو ——— مرحوم بائیسکل اسی طرح چلاتے جیسے کوئی بیمار گھوڑا لدا ہوا تانگہ گھسیٹ رہا ہو۔

نہ جانے وہ زندگی کے کتنے محاذوں پر لہولہان ہو رہے تھے مگر وہ زندگی کے سامنے ہتھیار ڈالنے پر ہرگز آمادہ نہ تھے۔ میدان جنگ میں کام آجانے والا سپاہی، ہارا ہوا سپاہی نہیں ہوتا۔ میں نے جس جس طرح کی مادی و ذہنی پریشانیوں میں گھرے ہوئے انہیں دیکھا ہے، کوئی اور ہوتا تو مدتوں پہلے گھٹنے ٹیک دیتا مگر وہ برابر لڑے جا رہے تھے، ان کے

ترکش کا سب سے کارگر تیر ان کی زندہ دلی اور شگفتہ طبعی تھی۔ وہ صعوبتوں میں مسکرا لیتے اور امنڈتے ہوئے آنسوؤں کو قہقہوں میں ڈھال لینے کا فن جانتے تھے ان کی مشکلوں پر دوسروں کے دل لرز اٹھتے مگر ان کے ماتھے پر میں نے کبھی شکن نہ دیکھی۔ ہر وقت شگفتہ و متبسم۔ خود ہنستے دوسروں کو ہنساتے۔ گفتگو بھرپور اور دلچسپ ہوتی۔ چہرے پر بچھی ہوئی زردی کے اوپر ہمیشہ مسکراہٹوں کا ایک چمن کھلا رہتا۔ مرحوم نے اپنے زخموں کو پھول بنا لیا تھا۔

انہوں نے زندگی میں اگر کہیں شکست کھائی ہے تو ادب میں، جو ان کی زندگی تھی۔ حالات و اتفاقات نے فن کار کو اہل کار بنا دیا تھا۔ ان کے مشاغل میں دور دور تک افسانہ نگار کا سراغ نہ ملتا تھا ——— آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا ——— لکھنا پڑھنا موقوف کر رکھا تھا۔ میں ترغیب بھی دلاتا تو آمادہ نہ ہوتے کہتے "بھائی صاحب ادب میں کیا رکھا ہے، نہ جانے کتنے مسودات نامطبوعہ پڑے ہیں۔"

ایک مرتبہ حفیظ صاحب نے بہت جھنجھوڑا تو تاؤ میں آگئے، ایک ناول شروع کر دی اور چند مہینوں میں سات آٹھ سو صفحات لکھ ڈالے۔ لیکن اس کے باوجود ادیب کے اندر وہ جو بچھنے کی ایک امنگ ہوتی ہے۔ زندگی کی طرف جو اس کا ایک اپنا رویّہ ہوتا ہے۔ وہ بات کلیتہً نہیں تو بڑی حد تک ان کی زندگی میں سے نکل چکی تھی۔ افسانہ نگار ڈاکٹر اعظم کریوی اپنی موت سے بہت پہلے مر چکا تھا۔ کسی دن ادب کی ایسی ہی کلیل اٹھتی تو بائیسکل اٹھاتے اور مولانا شاہد احمد یا مولانا رزاق الخیری سے مل آتے یا میر بیٹھے بیٹھے مولانا عبدالحق اور انجمن ترقی اردو کی "اندرونی سیاسیات" کی باتیں

کرتے رہتے جن سے نہ معلوم کیوں انہیں بے حد لگاؤ تھا۔ ہمیں جب کوئی موضوع گفتگو نہ سوجھتا تو انجمن اردو کا ذکر چھیڑ دیتے۔

"تو ڈاکٹر صاحب آج کل مولانا عبدالحق کن لوگوں کے قبضہ میں ہیں؟"

بس پھر ڈاکٹر صاحب اورنگ آباد سے چل کر یہ سمجھیے کہ گویا پا پیادہ دہلی سے ہوتے ہوئے کراچی پہنچتے، انہیں مولانا عبدالحق کی مروت و شرافت اور مختلف ادوار میں ان کے حاشیہ نشینوں کے خبث و ذلت کے سینکڑوں مزیدار سے مزیدار واقعات یاد تھے۔ زبان پر ان کو بڑا قابو تھا۔ ان واقعات کو ایک چسکہ کے ساتھ پہروں سناتے چلے جاتے۔

لوگوں سے شناسائی پیدا کرنے میں مرحوم بڑے تیز تھے۔ راہ چلتے ہوئے، بس یا ٹرام میں بیٹھے ہوئے، اجنبی لوگوں سے خاصی رسم و راہ پیدا کر لیتے۔ ٹیلی فون کرتے ہوئے کوئی غلط نمبر مل جاتا تو اکثر و بیشتر اس اتفاقیہ تقریب کو باقاعدہ تعارف کی تقریب بنا لیتے۔ کمال یہ تھا کہ لوگوں کو پھر یاد بھی رکھتے۔ البتہ نئی دوستیاں پیدا کرنے کی اب انہیں فرصت تھی نہ ہمت۔ تاہم جس کسی سے اخلاص و مودت کا رشتہ قائم ہو جاتا دیدہ و دل اس کے سامنے فرش کر دیتے۔ پرانے تعلقات کے رکھ رکھاؤ، احترام اور وضع داری میں اپنی مجبوریوں، معذوریوں کو یکسر بھول جاتے۔ ایک مرتبہ کراچی سے دو ہی سائیکل پر واپس آ کر کہنے لگے۔

"بھائی صاحب کل شام کا کھانا ہمارے ہاں کھایئے گا۔"

"خیریت تو ہے؟ میں نے تعجب سے پوچھا۔

معلوم ہوا کہ ہندوستان کے ایک مشہور شاعر کو جو ان دنوں کراچی آئے ہوئے

تھے، کھانے پر مدعو کر آئے ہیں۔ یہی نہیں، ان کے ساتھ پندرہ بیس اصحاب کو بھی
جو اس وقت جناب شاعر کی دربا داری میں مصروف تھے۔ فرمایا ——— مجھے معلوم
ہے اس ایک دعوت کا للیا ہوا قحط مہینوں اب میرے گھر میں رہے گا۔ مگر بھائی صاحب
مدت کے بعد ان سے ملاقات ہوئی ہے۔ ملنے چلا گیا تھا تو اب کیا کرتا ——— ان
سے کیا کہتا؟"

یہ نا ممکن تھا کہ آدمی ان کے قریب رہے اور ان کے اخلاص ان کے انکسار، ا
انسانی ہمدردی اور تعلقات میں ان کی گرم جوشی سے متاثر نہ ہونے پائے۔ وہ جس
کسی کے قریب آنا چاہتے تھے۔ انتہائی کشادگی و خود سپردگی کے ساتھ اپنے آپ کو
اس کے سپرد کر دیتے تھے ان کی شخصیت شہد اور موم کی بنی ہوئی تھی۔ میں نے دو سالوں
میں کبھی ایک سنگریزے کی کسک بھی ان میں محسوس نہیں کی۔

ہم ۱۹۵۳ء میں ایک دوسرے سے جدا ہوئے۔ اس درمیان میں مراسلت کا
سلسلہ برابر جاری رہا وہ کچھ عرصے وزارت دفاع میں کلرکی کرتے رہے پھر بے کار ہو گئے
پھر ایک خط سے معلوم ہوا کہ ایک انگریزی روزنامے میں سب ایڈیٹر ہو گئے ہیں مگر
دوسرے ہی خط سے پتہ چلا کہ پھر بے کار گھوم رہے ہیں۔ آخر آخر میں حالات روبراہ ہونے
لگے تھے۔ حفیظ صاحب اتنے میں پھر ایک نئے محکمے کے ڈائریکٹر مقرر ہو چکے تھے،
انہوں نے ڈاکٹر صاحب کو اپنا سیکرٹری بنا لیا تھا، اور اپنے محکمے میں کسی ذمہ دار عہدے
پر ان کی تقرری کی کوشش بھی کر رہے تھے، میرے لئے یہ خبر بڑی خوش آئندہ تھی۔
میں خود سوچ رہا تھا کہ اگر ممکن ہو تو کسی صورت میں بھی وہیں پہنچ جاؤں۔ ڈاکٹر
صاحب ہر خط میں نئی زندگی کے بڑے ارمان انگیز نقشے کھینچ رہے تھے۔ ان کا آخری

خط مجھے اٹھارہ یا انیس جون ۵۵ء کو ملا۔ امید کی روشنی سے بھرا ہوا خط تھا۔ پرانے ناول کی اشاعت کے سلسلے میں یہ خوشخبری دی تھی کہ لاہور کے ایک ممتاز ناشر سے معاملہ ہو رہا ہے اور یہ بشارت بھی کہ ایک نئی ناول کی طرح پڑ چکی ہے۔ میں دل ہی دل میں دوست کی بحالی و آبادی پر خوش ہو رہا تھا کہ ناگاہ تیسرے یا چوتھے روز اخبار میں یہ وحشت ناک خبر دیکھی کہ ڈاکٹر اعظم کریوی قتل کر دیئے گئے ہیں؟ ——— نہیں، یہ نہیں ہو سکتا۔ ایسا کون شقی القلب ہو گا جو ڈاکٹر اعظم کو قتل کر دے؟ سانحہ کی صحت کا کسی صورت یقین نہ آتا۔ ان کی موت کی ہزاروں دوسری صورتیں ذہن میں آتی تھیں لیکن ان کے قتل ہونے کو دل نہ مانتا تھا۔

کراچی میں حفیظ صاحب سے پوچھ بھیجا تو انہوں نے بھی تصدیق میں لکھ دیا ——— "ہاں سچ ہے، کاش غلط ہوتا" ——— اتنے میں اخباروں میں تھوڑی سی اور تفصیل آئی۔ لکھا تھا کہ ایک بائیسکل بھی مرحوم کی نعش کے قریب پائی گئی ہے۔ یقیناً یہ وہی سائیکل ہو گی۔ میرا بس ہو تو میں اس کو قومی نوادرات کی کسی گیلری میں محفوظ کر دوں اور اس کے ہنڈل کے ساتھ یہ کتبہ لٹکا دوں۔

"یہ عظیم افسانہ نگار ڈاکٹر اعظم کریوی کی بائیسکل ہے۔ جو اپنے پیچھے کئی یتیم بچے، کئی غیر مطبوعہ مسودات، ایک فراموش گار قوم اور یہ بائیسکل چھوڑ گئے ہیں۔"

سنگاپور کا میجر حسرت

دوسری عالمگیر جنگ کے خاتمے پر جب اتحادی قابض فوجیں ملایا کے ساحل پر اتریں تو مولانا چراغ حسن حسرت اس کے ہراول دستوں میں شامل تھے۔ آپ دو سال سے کچھ اوپر سنگاپور میں مقیم رہے۔

مولانا حسرت جنوب مشرقی ایشیائی کمان کے شعبہ تعلقات عامہ سے وابستہ تھے اور ہیڈ کوارٹر سے شائع ہونے والے ہندوستانی عسکری اخبارات کی ادارت و نگرانی کا فریضہ ان کے سپرد تھا۔

ہم دونوں (مسعود و ضمیر) ان کے نائب و معاون کی حیثیت میں اس شعبے سے متعلق تھے۔ ہمیں اپنی اس خوش بختی پر بڑا فخر ہے کہ ہمیں اپنے زمانے کے ایک صاحب طرز انشا پرداز، ایک بڑے صحافی اور ایک بہت بڑے انسان کو بہت قریب اور بڑی تفصیل سے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ جو لوگ اجنبی سرزمینوں میں فاتح لشکروں کی زندگی کا تجربہ رکھتے ہیں وہ اس امر کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ ہمیں حسرت صاحب سے کتنا اور

کیسا قرب حاصل رہا ہوگا۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ یہ زندگی کسی چہرے پر کوئی نقاب باقی نہیں رہنے دیتی۔

ہمارے رفقاء میں سے کیپٹن (اب لیفٹیننٹ کرنل) جاوید خٹک۔ کیپٹن (اب کمانڈر) حسن عسکری جو ادبی دنیا میں ابن سعید کے نام سے مشہور ہیں۔ میجر احمد علی خان جو آج کل برطانیہ میں پاکستان کے معتمد تجارت ہیں۔ کیپٹن انعام قاضی، اور کیپٹن (اب لیفٹیننٹ کرنل) رشید حیات پاکستان کے حصے میں آئے ہیں یہ سب دوست وہاں "قوم کے نام سے یاد کئے جاتے تھے اور حسرت اس 'قوم' کے 'مرشد' تھے، پھر آگے 'قوم' کے بھی اندر مسعود اور ضمیر کو مرشد کا خصوصی قرب حاصل تھا مسعود دفتر میں ان کا نمبر تین تھا اور ضمیر دفتر سے باہر ان کا ایڈی کانگ!

اس مطالعے سے اسی دور کے حسرت کا تذکرہ مقصود ہے۔ چند جھلکیاں، چند باتیں، چند یادیں!

ہمارے لکھنے کا طریق کار یہ رہا ہے کہ واقعات کی ترتیب میں —— قربتوں اور فاصلوں کے مطابق، کچھ حصہ مسعود نے لکھا ہے اور کچھ ضمیر نے۔ مولانا جہاں ایک کے ہاتھ سے نکل کر دوسرے کے قبضے میں چلے گئے ہیں، ایک نے قلم روک کر جہاں کہنا چاہیئے کہ مولانا کو دوسرے کے سپرد کر دیا ہے۔

مولانا حسرت کی بے وقت موت ہماری تہذیبی تاریخ کا ایک عظیم سانحہ ہے یہ ایک فرد کی موت نہیں، ایک روایت ایک ادارے کی موت ہے۔ ہم نیازمندوں کے لئے ان کی موت ایک گہرے ذاتی زخم کی حیثیت رکھتی ہے۔ زندگی میں کسی کے ساتھ دو قدم چل کر بچھڑ جانے پر قلق ہوتا ہے۔ یہ تو اس دوست کا بچھڑنا ہے جس کے

ساتھ ہم کامل دو برس تک ایک دفتر ہی نہیں، ایک گھر میں بھی رہے ــــــ یہ تو اس مرشد کی رخصت کا دائمی گھاؤ ہے جس کے قدموں میں بیٹھ کر ہم نے قلم پکڑنا سیکھا ہے ـــــــ یہ تو اس انجمن کے اجڑ جانے کا ماتم ہے کہ جس کی روشنی ہی کے سبب آج ہم اپنی زندگی کو ایک غیر معمولی متاع سمجھتے ہیں۔ یہ غم تو اب جان کے ساتھ ہی جاتے گا۔ لیکن اس مضمون میں تحریر کے انداز کو ہم نے عمداً ہلکا پھلکا رکھا ہے ہمارا عقیدہ ہے کہ روتے بسورتے لہجہ میں مولانا کی شخصیت سے انصاف کرنا تو کجا، ان کو چھو سکنا بھی ناممکن ہے۔ ہم نے مرشد کے تذکرے کے لئے وہی اسلوب چنا ہے جو خود ان کا اسلوب حیات تھا۔ ہم حسرت صاحب کی پسند و ناپسند سے واقف ہیں۔ ہم اپنے مرشد کو جانتے ہیں۔

(م ض)

لیجئے اب ضمیر سے سنئیے:

مرشد مجھ سے پہلے سنگاپور پہنچ چکے تھے۔ جاوید کے ہمراہ جس وقت میں ہالینڈ پارک کے ایک وسیع، دلکشا بنگلے کے اندر پہنچا تو مرشد ـــــــ قوم کے دل میں بیٹھے ہوئے دوپہر کا کھانا کھا رہے تھے۔ میں "شیرہ" کے زمانے سے ان کا نیازمند تھا۔ دیکھتے ہی کھانا چھوڑ کر مجھ سے لپٹ گئے۔ اپنے پہلو میں بٹھا لیا اور پھر لنچ کی اسی ایک نشست میں بیٹھے بیٹھے ڈھیروں باتیں کر ڈالیں۔

"خوب پہنچے ہو میرے بھائی۔ آج رات ظہیر کی سالگرہ کی دعوت ہے مولانا آج ہمیں ایک گا کر پڑھنے والے شاعر کی سخت ضرورت تھی۔ سبحان اللہ لاہور کا بکھرا ہوا شیرازہ کہاں آکر جمع ہو رہا ہے ـــــــ لو چانولوں پر یہ ٹن کی مچھلی بچھا کر کھاؤ

یہاں تو یہی کچھ مردار کھانے کو ملے گا میاں! وہ تمہاری یونینسٹ قسم کی روٹی یہاں کہاں؟"

اب حاضرین سے تعارف شروع ہوا:

"وہ جناب انعام قاضی ہیں۔ تم ان کا نام غالباً پہلی مرتبہ سن رہے ہو مگر مشہور ادیب ہیں ——— وہ دھان پان صاحبزادے مولانا عسکری ہیں۔ جاوید کی رائے میں اپنے نامور والد میرزا محمد سعید دہلوی سے بھی بڑے ادیب ہیں ——— یہ رشید حیات ہیں، بس رشید حیات، محض و خالص۔ جاوید سے بھی مل چکے ہو۔ آپ جہلم اور فلم سے ہو کر علم کے کوچے میں وارد ہوئے ہیں ——— اور حضرات یہ مولانا ضمیر جعفری ہیں، جہلم کے رہنے والے، جہاں کے لوگ خدا کے تصور کیلئے تھانیدار کو دیکھتے ہیں۔

پھر اس شام ظہیر کی سالگرہ منائی گئی۔ یہ ظہیر ان کی بے اندازہ محبت کی پہلی جھلک تھی جو ہم نے دیکھی۔ مرشد نے جزیرے کے تقریباً سبھی انڈین افسروں کو مدعو کر رکھا تھا۔ دو چار خوش ذوق انگریز جوڑے بھی موجود تھے۔ محفل جمی ——— تو مرشد میزبان کے بجائے کچھ اس طرح مہمان سے بنے بیٹھے رہے۔ جیسے انہیں اپنے سگریٹ کے علاوہ کسی چیز سے کوئی واسطہ نہ ہو ——— مرنے کی ادا یاد نہ جینے کی ادا یاد ——— مگر جب پھر بوتلوں کے کاگ اڑنے لگے تو مرشد نے چہکنا شروع کیا اور اب جو منظر بدلا ہے تو پوری انجمن گویا تنہا حسرت کی ذات سے عبارت تھی۔ میجر احمد علی خاں کے الفاظ میں حسرت کا چراغ روشن ہو گیا۔ ان کے لبوں سے شعر و ادب، تاریخ و تصوف، طنز و ظرافت، زندگی اور اس کی چاندنی کا ایک سبک آبشار جاری تھا ——— تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا۔

یہ محفل، جو مرشد کی اصطلاح میں "بزمِ ہاؤ و ہو" کہلاتی تھی۔ اگلی صبح کے کوئی تین بجے تک قائم رہی۔ یوں کہنا چاہیئے کہ مرشد اپنے چند جاں نثاروں کے ساتھ قائم رہے ورنہ تین چوتھائی محفل وہیں کرسیوں پر پاؤں پسار کر سو گئی تھی۔ مرشد تو وہیں کھڑے کھڑے "صبوحی" تک لگا دینے کا حوصلہ وارادہ رکھتے تھے مگر نہ معلوم شاید ذخیرہ ختم ہو گیا تھا یا شاید جس کسی میں ابھی تک دوسرے کو تھامنے پکڑنے کی سکت باقی تھی وہ ان کو تھام پکڑ کر خوابگاہ میں لے گیا اور یہ محفل بالآخر اس طرح ختم ہوئی کہ اس کو جمتے تو سب نے دیکھا تھا مگر برخاست ہوتے شاید ہی کسی نے دیکھا۔ نسبتاً ہوش مند لوگوں کو ڈر تھا کہ اگر کل صبح انہیں لوگوں نے دفتر لگانا ہے تو یہ دفتر لگ چکا۔ مرشد کی نسبت سب کو قطعی یقین تھا کہ وہ کل کیا معنی، اب ایک پورے ہفتے کے لئے گویا معطل ہو گئے مگر پھر دوسری صبح کو جو پہلی آواز ہالینڈ پارک کے خوبصورت گنبدوں اور روشن غلام گردشوں میں گونجتی ہوئی سنائی دی وہ مرشد کی آواز تھی۔

"جاوید، عسکری، ضمیر —— قاضی صاحب"

"ارے او ساون کے بادلو!"

"ابے او خبیثو!"

اور بھاگم بھاگ ہم لوگ جب تیار ہو کر ناشتے کے میز پر پہنچے تو وہ پیٹے کے آخری پرزے کو کانٹے کی نوک پر بٹھا کر خود دفتر جانے کے لئے تیار کھڑے تھے۔ جہاں سہ پہر تک اب انہیں مسعود کے قبضے میں رہنا تھا۔ لہٰذا یہ روداد مسعود ہی سے سنیئے۔

مجھے دفتر میں ان کا نمبر ۲ ہونے کا امتیاز حاصل تھا۔ اس سے پہلے میں کلکٹری میں

ان کے ساتھ کام کر چکا تھا۔ مرشد میرے لئے کوئی نئے، باس، نہ تھے بنگا پور پہنچا تو پہلے ہی روز مجھے پورے اعتماد میں لیتے ہوئے فرمایا:

مولانا آپ کا انتظار ہی کر رہا تھا۔ اب یہ کام سنبھالیں۔ میں بڈھا آدمی ہوں مجھے پورے اعتماد میں لیتے ہوئے فرمایا: کچھ پڑھنے کا وقت مل جائے۔ کچھ گھوم پھر لوں۔ آپ کی تھوڑی بہت مدد کر دیا کروں گا۔"

اس تمام وقفہ میں سگریٹ منہ سے نہیں نکلی۔ دھواں آنکھوں میں جا رہا تھا کبھی کبھی تو یہ گمان ہوتا کہ دھواں آنکھوں میں جا نہیں رہا، آنکھوں سے آ رہا ہے۔ درمیان میں جھنجھلا کر آنکھیں ملنے بھی لگتے۔ لیکن آنکھوں کی جلن اور سگریٹ کے دھوئیں میں کوئی رشتہ شاید وہ کبھی دریافت نہ کر سکے تھے۔ علل و معلول کی اکثر کارفرمائیوں سے مرشد عموماً بے تعلق و بے نیاز ہی رہے۔

"ہاں تو مولانا مسعود صاحب بہت اچھا ہوا کہ آپ آ گئے —— لو بھئی چائے اور یہ سگریٹ —— جاوید ماہیں —— سنگاپور کو آپ کلکتہ سے زیادہ تقوئی شکن پائیں گے۔"

اتنے میں مجھے کپڑا جلنے کی بو سی آئی۔ میں نے کہا —— مولانا کہیں کوئی کپڑا تو نہیں جل رہا؟" —— بولے —— "آپ کہہ رہے ہیں تو ضرور جل رہا ہو گا۔ آپ بڑے خطرناک آدمی ہیں —— پھر ذرا چلا کر بولے —— "ارے قاضی صاحب ذرا ادھر تو تشریف لائیں۔ دیکھیے کوئی کپڑا تو نہیں جل رہا؟ یہ کہیں سے بُو سی کیا آ رہی ہے؟" —— "اس کہیں سے بُو" کا راز کھلا کہ جناب کی پتلون کا پائنچا چار پانچ انچ کے قریب راکھ ہو چکا تھا۔ فرمانے لگے —— "مولانا یہ سگریٹ بھی بڑی

واہیات چیز ہے، سوچتا ہوں کہ اس لعنت کو چھوڑ ہی دوں" اور شام تک سگریٹ اور ماچس کے خالی بکسوں سے آدھی ٹوکری بھری پڑی تھی۔

مرشد کی باتیں کرتے ہوئے تسلسل یا اسلوب کا قائم رکھنا مشکل ہو جاتا ہے خود انہوں نے زندگی کو اسلوب کی بندشوں میں کبھی قید نہ ہونے دیا۔ فوج کے سخت گیر ضوابط بھی انہیں کبھی پابند نہ کر سکے۔ ایک مرتبہ جب افسر اعلیٰ نے کسی بات پر باز پرس کی تو جواب میں یہ شعر لکھ بھیجا ؎

جرمنی ختم اور اس کے ساتھ جاپانی بھی ختم
تیری کرنیلی بھی ختم اور میری کپتانی بھی ختم

کلکتے کی بات ہے ایک روز دفتر چلے آرہے ہیں۔ اس شان سے کہ منہ میں سگریٹ ہے۔ فیلڈ سروس ٹوپی بغل میں دبی ہوئی ہے اور کندھوں پر ایک طرف تین ستارے لگے ہیں اور دوسری طرف دو۔

میرے وہاں پہنچنے پر مرشد نے مطالبہ کیا ایک ذرا سی فرصت اور سیر و سیاحت کی اک تھوڑی سی مہلت کے عوض اپنے تمام فرائض مجھے تفویض کر دینے کا فرمان تو جاری کر دیا مگر ہمیں معلوم تھا کہ یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ مطالعہ کے لئے مرشد کو مہلت کی ضرورت ہی نہ تھی جس طرح اور لوگ کتاب پڑھتے ہیں اس طرح ہم نے انہیں پڑھتے کبھی نہیں دیکھا۔ ان کی کیفیت تو کچھ ایسی تھی کہ کتاب اٹھائی اسے چھوا، ٹٹولا، سونگھا، چند ایک ورق الٹ پلٹ کر دیکھے اور بس۔ اس کے بعد وہ کسی باطنی عمل سے کتاب کا نفس مضمون، کتاب کی روح، سب کی سب اپنے ذہن میں منتقل کر لیتے۔ دوسرے روز آپ اس کتاب کے متعلق بات کریں

تو وہ اس کے کرداروں کا حسب نسب، کہانی کی اٹھان، اس کی کمزوریاں اور خوبیاں، مصنف کا سٹائل اور فلسفہ اور پھر دس اور کتابوں سے اس کی جزئیات کا موازنہ یہ سب یوں بیان کر جاتے جیسے یہ کتاب انہوں نے مکتب میں سبقاً پڑھی ہو۔

رہی سیر و سیاحت کی فرصت، تو یہ بھی ایک طرح کی آرزو ہی تھی جسے عملی رنگ دینے کا ارادہ مرشد نے غالباً کبھی کیا ہی نہ تھا۔ سچ مچ کی سیر و سیاحت مرشد کے بس کی بات ہی نہ تھی۔ پھر سیر کے لئے انہیں طول طویل راستے ناپنے کی ضرورت بھی کیا تھی۔ حسن ان کے لئے ایک داخلی کیفیت تھی۔ حسن ان کی آنکھوں اور ان کے دل میں تھا۔ خارجی اسباب کا سہارا اگر انہیں درکار تھا تو نہایت سبک سا۔ میس کی ایک کھڑکی سے جھانکو تو چھالیہ کے کشیدہ قامت پیڑوں کے جھنڈ آپس میں سرگوشیاں کرتے نظر آتے تھے۔ دوسری طرف بالکنی کے باہر چینی چیری کا ایک تناور درخت باہیں پھیلائے کھڑا تھا۔ پشت کو اٹھتی ہوئی پہاڑی کی پیشانی پر ایک عرب رئیس کا بنگلہ تھا جس کے زمردیں لان اوپر سے لڑھکتے، پھسلتے ہمارے میس کے حاشیے پر آ کر کہیں رکتے تھے۔ ذرا ہٹ کر ناریل کے پیڑ ایک دوسرے پر جھکے ہوتے تھے جن کا منظر چاندنی راتوں میں بڑا فسوں خیز ہوتا تھا۔ مرشد فرمایا کرتے۔ چائنیز لین کے مناظر جس شخص کے ذوق کی تسکین نہیں کر سکتے اس گدھے کو سارے سوئٹزرلینڈ میں گھما لائیے تو بھی اس کے پلے کچھ نہیں پڑے گا۔

اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ مطالعہ و سیاست کی فرصت کی خاطر دفتر کا کاروبار میرے حوالے مرشد کی ایک ادا تھی۔ لیکن اس ادا میں تصنع یا تکلف ہرگز

نہ تھا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اس وقت اپنی باتوں پر واقعی یقین کر رہے تھے ہو سکتا ہے کہ دل ہی دل میں انہوں نے بالی کے سفر کا کوئی تفصیلی نقشہ بھی کھینچ رکھا ہو۔ مجھے کچھ ایسا خیال پڑتا ہے کہ اس روز مرشد کوئی آدھ گھنٹہ پہلے ہی دفتر سے اٹھ کر چلے گئے تھے۔ دوسرے دن صبح کو ناشتے کے میز پر بھی موجود نہیں تھے۔ کمرے میں جھانکا تو دیکھا کہ کرتے پاجامے میں لیٹے سٹوری آف سان مائیکل میں مستغرق ہیں۔ "سٹوری آف سان مائیکل" مرشد کی تازہ ترین دریافت تھی۔ فرمایا ——— "مولانا اس سے بہتر کتاب میں نے تو آج تک نہیں پڑھی"۔ لیکن بعد میں ہم اس طرح کے غلو کے عادی ہو گئے۔ مرشد کا اندازہ ہی یہ تھا۔ ان کے مطالعہ کی کتابیں تو منتخب تو ہوتی ہی تھیں، بس جو کتاب شروع کرتے۔ اس کے عشق میں مبتلا ہو جاتے "سٹوری آف سان مائیکل" سے پہلے ٹالسٹائی کی "وار اینڈ پیس" دنیا کی بہترین کتاب تھی اور اس سے پہلے ہکسلے کی "ایلیس ان غازہ"

ہم نے پوچھا "آپ دفتر میں تو نہیں تشریف لے جائیں گے"۔ ——— بولے ——— "مولانا مجھے تو آپ چھٹی ہی دے دیں۔ میں چاہتا ہوں . . . . مگر ہاں دیکھئے کوئی دس بجے کے قریب جیپ بھیج دیجئے گا۔ ذرا رفلیز لائبریری کا چکر لگا آؤں گا . . . ممکن ہے تھوڑی دیر کو دفتر میں بھی آ نکلوں"

ہمارا دفتر سیسل اسٹریٹ میں ایک عمارت کی بالائی منزل میں تھا سیسل اسٹریٹ کو سنگاپور کی فلیٹ اسٹریٹ کہہ لیجئے۔ اس زمانے میں سنگاپور کے تمام انگریزی اور ملائی روزنامے وہیں سے نکلتے تھے۔ جس جگہ ہم بیٹھتے تھے وہ جنگ سے پہلے ایک ڈچ تجارتی کمپنی کا دفتر تھا جو ملایا سے ربڑ اور مسالے برآمد، اور ڈنمارک

سے بیئر در آمد کرتی تھی۔ دفتر کیا تھا ایک وسیع ہال تھا جو کسی زمانے میں پارٹیشنوں سے مزین ہوگا مگر جاپانیوں کے چار سالہ تسلط میں ان تکلفات کا نام و نشان مٹ چکا تھا۔ جاپانی جس عمارت میں ایک مرتبہ بسیرا کر گئے اس کے دروازے کھڑکیاں تک غائب ہو جاتیں ساگوان کی بیش بہا الماریوں کو توڑ کر چاول ابالنے کے لئے چولہا سلگا لینا ان کے لئے کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ الغرض ہمارا دفتر بالکل ننگ دھڑنگ قسم کا دفتر تھا جس کے چوبی فرش بھاری بھر کم فوجی بوٹ ہر وقت ایک زلزلہ بپا کئے رکھتے تھے۔ ابھی دس بج کر کچھ منٹ ہی گئے تھے کہ اس زلزلے کی لرز اور گرج میں ایک نئی شدت پیدا ہوگئی اور ہم سمجھ گئے کہ مرشد تشریف لے آتے۔ موٹی موٹی کتابوں کا ایک "دو بغل بھر پلندہ" ریک میں پھینکا، ٹوپی اتاری سگریٹ منہ میں اڑسی اور ماچس کھٹکھٹاتے ہوئے بیٹھ گئے۔ ہم جانتے تھے کہ مرشد اخبار سے جدائی زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر سکیں گے۔ مرشد کی نظروں میں ہم سب جاہل تھے۔ کوئی ذرا کم، کوئی قدرے زیادہ۔ اخبار وہ بالکل ہمارے ہاتھوں میں کیسے چھوڑ سکتے تھے؟ چنانچہ آتے ہی جائزہ شروع ہو جاتا۔

"مولانا لائیے تو ادھر، یہ آپ کیا لکھ رہے ہیں —— مولانا یہ کوئی سرخی تو نہ ہوئی۔ ہمیں تو یہی بتایا گیا تھا کہ خبر کی سرخی میں پہلی سطر جملہ فعلیہ خبریہ ہونا چاہیئے —— آپ کو شاید ان سے تعارف نہ ہو لیکن مولانا مبتدا اور خبر، مضاف اور مضاف الیہ میں ایک بہت قریبی رشتہ ہوتا ہے —— اور —— بھئی محرم علی میں آپ سے عرض کر چکا ہوں کہ آپ ہر صبح کاتبوں کے قلم ضرور دیکھ لیا کریں کل کی سرخیاں تو ایک دوسرے کو کھانے کو دوڑ رہی تھیں —— حمید صاحب

"نون" کا دائرہ بنانے کی مشق اگر آپ نے لگ کر چار پانچ برس کر لی تو آپ "نون" بنالیا کریں گے۔ فی الحال تو آپ کا نون فیروز خان نون کا "نون" معلوم ہوتا ہے۔"

تعریف کے معاملے میں مرشد شقاوت کی حد تک سخت تھے۔ کچھ تو اس لئے کہ دوسروں کو ناپتے جانچتے وقت شاید نادانستہ دوسروں کا موازنہ اپنے ساتھ کر جاتے تھے اور ظاہر ہے کہ موازنہ ان سے ہو تو تعریف کے قابل کون نکلے؟ —— پھر انہیں یہ خیال بھی تھا کہ علم و ادب سے تعلق رکھنے والے آج کل کے نوجوانوں کی بر خود غلطی پہلے ہی تشویش ناک صورت اختیار کر چکی ہے انہوں نے تعریف کر دی تو مبادا دماغ بھی خراب ہو جائے۔ وہ حیران ہوتے تھے کہ یہ کیسا دور آگیا ہے کہ لوگ قواعد کے ابتدائی اصول جانے بغیر، عربی و فارسی کی تحصیل کے بغیر اساتذہ کے کلام کا مطالعہ کئے بغیر، شعر کی تہذیب اور اس کا مزاج سمجھے بغیر مصنف اور شاعر بن بیٹھے ہیں۔ "مست قلندر" میں ایک افسانہ چھپ گیا، چلو افسانہ نگار بن گئے۔ "پھلجھڑی" نے ایک غزل شائع کر دی، لیجئے شاعر ہو گئے۔ پھر تحسین باہمی کے حلقے قائم کر کے جہالت کے حصاروں میں قید ہو کر بیٹھ گئے۔

ایک مرتبہ مجھے بھی مزاحیہ کالم لکھنے کا شوق پیدا ہوا تھا۔ پہلے روز کالم مرشد کو دکھایا۔ کالم پر نگاہ جمائے سگریٹ سے سگریٹ سلگاتے گئے۔ پڑھ چکے تو سگریٹ کے کش بیچوں بیچ ایک مبہم سی —— "ہونہہ" —— کہہ کر کاغذ مجھے دے دیا۔ منہ لٹکائے ہوئے میں واپس اپنی جگہ پر آبیٹھا۔ دوسرے روز پوچھتے ہیں —— مولانا وہ اپنا کالم آپ نے کیا کیا۔ آج کے اخبار میں تو نہیں ہے؟ میں نے عرض کیا ——

پھاڑ کر پھینک دیا تھا" —— فرمایا —— "دے دیتے کیا ہرج تھا۔ اور لغویات بھی تو چھپتی رہتی ہیں" —— مرشد کی زبان سے یہ بھی گویا حوصلہ افزائی کے کلمات تھے۔ اس کے بعد کبھی کبھار میں کالم لکھ کر مرشد کے پاس لے جاتا اور ان سے —— "ہونہہ" —— وصول ہو جاتی جو کالم کی اشاعت کی اجازت بھی ہوتی۔

ایک روز تو انہوں نے تعریف کی حد ہی کر دی۔ ارشاد ہوا —— مولانا اگر آپ محنت کریں تو ممکن ہے ایک روز آپ کو کالم لکھنا آجائے۔ آپ کو یہ بہت بڑا ایڈوانٹیج ہے کہ آپ ان پڑھ ہیں اس لئے آپ فلاں یا فلاں کے اسلوب نقل کرنے کے بجائے خود اپنی سیدھی سادی زبان میں بات کہہ جاتے ہیں۔ یہ تحریر کی بڑی خوبی ہوتی ہے۔ نگارش کی اپنی طرز اسی سے بنتی اور نکھرتی ہے۔"

ان دو جملوں کے علاوہ مرشد کے منہ سے کبھی اور کوئی توصیفی کلمہ سننا نصیب نہ ہوا۔ اگرچہ پس پشت وہ اپنے شاگردوں کی تھوڑی بہت تعریف کر دیا کرتے تھے۔

مرشد کے ساتھ کام کرنا تلوار کی دھار پر چلنا تھا۔ معمولی سے معمولی غلطی کو اپنے اسلوب طنز کی تازگی کے ساتھ وہ مہینوں تر و تازہ رکھتے۔ یہ ناممکن تھا کہ کسی روز وہ کام سے مطمئن ہو جائیں یا کھل کر شاباش دے جائیں۔ معیار کے معاملہ میں وہ قدم قدم پر مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا جالب، اور نصیر حسین خیال کا حوالہ دیتے۔ ضمیر کی رائے تھی کہ اگر خود مولانا آزاد، مولانا جالب اور نواب خیال بھی ان کے سٹاف میں ہوتے تو ان کا مرتب کیا ہوا اخبار مرشد کے معیار پر شاید ہی پورا اترتا۔ مرشد کے ساتھ کام کرتے ہوتے ایک عجیب سی گھٹن طاری رہتی تھی مگر ان کے جانے کے بعد ہی محسوس ہوا کہ اس گھٹن سے ہم نے کتنا کچھ سیکھا اور ان کی نظر اپنے پیشے میں

ہمارے قدوقامت کو کتنا اونچا لے گئی تھی۔ علم وفن پر ان کا اپنا انداز طالب علمانہ تھا۔ اپنے آپ کو انہوں نے کبھی فارغ التحصیل نہیں دیکھا۔ وہ ہمیشہ، ہر وقت، علم کے اکتساب میں معروف رہے۔ کہا کرتے "اخبار نویسی کرتے پچیس برس ہو گئے ہیں لیکن یہاں فوج میں آکر اور پبلک ریلیشنز کے اپنے ساتھی انگریز صحافیوں کے کام کو دیکھ کر صحافت کے کئی گُر اب سمجھ میں آئے ہیں" ——— فرینک اون کے آپ بڑے مداح تھے۔ فرینک اون ان دنوں برطانوی فوجوں کے اخبار "سی آک" کا ایڈیٹر یعنی انگریزوں کا چراغ حسن حسرت تھا۔ آج کل وہ غالباً برطانیہ کے سب سے کثیر الاشاعت روزنامہ ڈیلی میل کا ایڈیٹر ہے۔

سنگاپور میں "دوالفکیر" کتابوں کی ایک بڑی دکان تھی جس کے مالک ایک مدراسی مسلمان تھے۔ مدراس میں عبدالفقیر نام عام سننے میں آتا ہے۔ پتہ نہیں "دوالفکیر" ——— عبدالفقیر ہی کا مخفف تھا یا ذوالفقار کی مالاباری شکل۔ مرشد اسی تجسس میں دو ایک مرتبہ اس دکان پر گئے اور پھر یہ معمول بن گیا کہ دفتر سے واپسی پر وہاں ضرور رک جاتے۔ سنگاپور کی مرطوب آب وہوا میں ساری دوپہر کام کرنے کے بعد ہمیں گھر جانے کی جلدی ہوتی مگر مرشد ہیں کہ دکان میں کھڑے ایک شیلف سے دوسرے شیلف اور دوسرے سے تیسرے کی طرف کھچے چلے جا رہے ہیں۔ کتابوں کی دکان کے اندر جا کر وہ باہر نکلنے کا راستہ ہی بھول جاتے۔ ایک ایک کتاب سے تانک جھانک ہو رہی ہے ادھر ہم دروازے پر کھڑے یا جیپ میں بیٹھے انہیں کوس رہے ہیں بعض اوقات ہم انہیں اتار کر خود چپکے سے فرار ہو جاتے اور جیپ واپس بھیج دیتے۔ مرشد کو اس پر بڑا دکھ ہوتا اس لئے نہیں کہ ہم نے ان کا انتظار کیوں نہ کیا۔ اس لئے کہ ان کے

ساتھ اکٹھے رہنے اور کام کرنے کے باوجود ہم اتنے کور ذوق اور بے حس کیوں تھے کہ کتابیں قطار در قطار اور منزل بر منزل رکھی ہیں مگر ہم میں کی طرف دوڑ رہے ہیں۔ مرشد کا بس چلتا تو وہ ہمیں کے بجائے "دوالفکیر" یا کتابوں کی کسی دوسری دکان ہیں بستر لا ڈالتے۔

دفتر سے مرشد کبھی غیر حاضر نہیں ہوئے۔ ویسے ارادہ انہوں نے کئی مرتبہ کیا۔ بعض اوقات محض اس خیال سے کہ یونٹ کا افسر کمانڈنگ ہونے کی وجہ سے ان میں اور دوسروں میں آخر فرق ہی کیا ہوا؟ ان سے آخر کون سوال کر سکے گا کہ آپ دفتر کیوں نہیں آئے؟ مگر پھر دفتر کے بغیر جی بھی نہ لگتا۔ ایک دو گھنٹے کے بعد ٹیلی فون آجاتا کہ جیپ بھیج دو۔ دفتر آئے اور کوئی چیز لکھنے بیٹھ گئے ایک دفعہ اُردو کے شاعروں کے تذکرے کا ایک سلسلہ اخبار میں شروع کر دیا اور کسی کتاب یا حوالہ کی مدد لئے بغیر بیسیوں شعراء بھگتا دیئے جن شاعروں کا ہم میں سے کسی کو نام بھی یاد نہ تھا، ان کی تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات ہی نہیں، بلکہ ان تاریخوں میں اختلافات کی بحث ان کے کلام کی خصوصیات اور چیدہ چیدہ اشعار یوں قلم بند کرتے جاتے جیسے کہیں سے نقل کر رہے ہوں۔

قلم اور زبان پر مرشد کا جتنا زور چلتا تھا زندگی کے دوسرے مسائل اتنے ہی ان کے قابو سے باہر تھے۔ کسی ارادے کی تکمیل ان سے نہیں ہوسکی ویسے جناب کے ارادے بھی ناقابل عمل ہوتے۔ مثلاً وہی بالی کے سفر کا ارادہ لیجئے جس کی طرف سرسری سا اشارہ اوپر آچکا ہے۔ اس زمانے میں بالی کا سفر اتنا ہی آسان تھا جتنا کہ پک نِک پر راولپنڈی سے واہ تک چلے جانا ہے۔ ایئر فورس کے ہوائی جہاز چاروں طرف

بھاگے پھرتے تھے اور پبلک ریلیشنز کا نام ہر سفر کے لئے مکمل سم سم کے معنی رکھتا تھا۔ لیکن مرشد بھلا عوام الناس کی طرح سفر کیوں کرتے؟ مرشد کے بالی کے سفر کا تصور یہ تھا کہ ضمیر ان کے ساتھ ہو۔ کچھ پیدل، کچھ تانگوں پر اور کچھ ٹٹوؤں پر وہ ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں پہنچیں۔ کھانے کا وقت جہاں آجائے پڑاؤ کر کے وہیں چولہا روشن کیا جائے۔ ایک آدمی لکڑیاں چن رہا ہو۔ دوسرا دیگچی مانجھ رہا ہو اور پگڈنڈی کے کنارے مرغی بھونی جا رہی ہو ۔۔۔۔ اس طرح کا ایک اور شاعرانہ ارادہ ان کا یہ تھا کہ سنگاپور سے دو چار میل پر ایک چھوٹا سا جزیرہ وہ پٹے پر لے لیں اور باقی زندگی وہاں مطالعہ و تصنیف میں گزار دیں۔ گھنٹوں اس سکیم کا ذکر اذکار رہتا۔ ایک دفعہ میں نے نہایت ہی غیر شاعرانہ سوال کر دیا کہ اس غیر آباد جزیرے بسر اوقات کی کیا صورت ہو گی۔ فرمایا ۔۔۔۔ "بھئی یہ جزیرے تو اللہ تعالیٰ نے جنت کے نمونے پر بنائے ہیں کہ فکر روزگار کا وہاں گزر تک نہیں ہے۔ اس مٹی میں آپ دھان کی مٹھی اٹھا کر پھینک دیں اور دوسرے مہینے فصل لپیٹ لیں۔ کھانے کے لئے مرغیاں پال لیجئے۔ پھر ناریل ہیں کہ آپ کے لئے اکل و شرب کے قاب سر پر اٹھائے کھڑے ہیں۔ صبح صبح ایک کشتی میں بیٹھ گئے اور کچھ تازہ بہ تازہ نو بہ نو مچھلی پکڑ لائے مولانا انسان کو اور کیا چاہیئے؟"

مرشد دراصل اپنی ذات میں ایک وضع اور ایک تہذیب کے سمبل تھے۔ لوگ کہتے ہیں مولانا چراغ حسن حسرت کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا، ان کا جسد فانی ختم ہو گیا مگر ان کا نام کبھی ختم نہ ہو گا۔ ممکن ہے یہ سب درست ہو لیکن ہمیں اس میں تسلی کا کوئی سامان نہیں ملتا۔ حسرت کا نام زندہ رہ سکتا ہے مگر ہم جانتے ہیں ہمارا مرشد اب یہاں نہیں ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی ادب و فن اور تہذیب و وضع داری کا ایک پورا دور تاریخ کے ایک

موڑ کے ادھر اوجھل ہوگیا ہے مکتب ہی نہ رہے تو اب کون ہوگا جو گھنٹوں اس تحقیق میں لگا رہے کہ جوں جوں کے بعد توں توں کہا جاتا ہے تو کیوں کہا جاتا ہے آج کسی لکھنے والے کی تحریر میں محاورے یا گرامر کی کسی غلطی کی طرف اشارہ کیا جائے تو جواب یہ ملتا ہے کہ جناب میں تو اس کو اسی طرح درست سمجھتا ہوں۔ مرشد ذرا سے اشتباہ پر سند کے لئے پریشان ہو جاتے تھے ——— " سالک صاحب فلاں محاورے کے متعلق کچھ الجھن سی لاحق ہو رہی ہے۔ کچھ یاد پڑتا ہے کہ منشی دیا شنکر نسیم نے اس محاورے کو اس طرح باندھا ہے مگر اب وہ مقام ذہن سے اتر گیا ہے۔ آپ کے ذہن میں تو کوئی سند ہوگی؟" ——— لیکن میں بھی کہاں سے کہاں پہنچ گیا، آئیے پھر سنگاپور کی طرف!

دفتر میں مولانا کے چہرے پر مسلسل خشونت سی طاری رہتی تھی جس کی وجہ سے دفتر کے اوقات میں ان سے کھل کر بات کرنے کی جرأت کوئی نہ کرتا۔ اس وقت وہ حسرت صاحب بلکہ بعض اوقات "سر" تک ہو جاتے تھے لیکن دفتر سے اٹھتے ہی سب حجابات اٹھ جاتے اور وہ حسرت صاحب سے اتر کر 'مرشد' ہو جاتے۔ جیپ کی اگلی نشست میں جناب بیل جاتے اور پچھلی نشست میں جاوید، انعام قاضی، ضمیر اور میں۔ اب فقرے پر فقرہ چست ہو رہا ہے۔ بات میں سے بات نکل رہی ہے۔ راستے میں اس بے تکلفی سے بولتے کہ سنگاپور کے ٹریفک کے تمام شور و غل کے باوجود پٹڑی پر چلتے ہوئے رہگیر ان کی بات سن سکتے تھے۔ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ کسی واقف کار نے کوئی ایسا انکشاف کر دیا جس پر غصہ، ندامت، تعجب یا کوئی اور مناسب ردعمل جو ہونا وہ تو ہوتا ہی تھا، سب سے زیادہ کوفت اس بات پر ہوتی تھی کہ "قوم" کا یہ قصہ باہر کیسے پہنچ گیا۔ بعد میں

پتہ چلتا —— "ارے بھئی کل جب تمہاری جیپ گذر رہی تھی۔ میں بر اس بہ روڈ پر "کون واہ" میں کھڑا تصویریں دیکھ رہا تھا کہ حسن صاحب کی آواز نے چونکا دیا اور پھر جو کچھ وہ فرما رہے تھے اس نے اور بھی —— الغرض دفتر سے باہر قدم رکھتے ہی مرشد کچھ اور ہو جاتے مگر داستان کا یہ حصہ ضمیر سے سنئے کہ وہ اس معاملہ میں "ماہر مرشدیات" ہے۔

دفتر میں میرا ان کا واسطہ کچھ ویسے کم تھا کچھ میں اس واسطے کو اور بھی کم رکھتا تھا۔ اس واسطے، سے بس یہ سمجھئے کہ کچھ خوف ہی آتا تھا۔ مرشد جب آواز دیتے، دل دہل جاتا۔ الٰہی خیر! نہ معلوم کم بخت کون سا محاورہ الٹا جا پڑا ہے؟ کس روزمرے کو تکلیف پہنچ گئی ہے؟ کہیں کوئی شتر گربہ تو نہیں پکڑا گیا؟ کسی جملے کی نشست نوبر خاست نہیں ہو گئی؟ کوئی بندھنے والا خیال کھل تو نہیں گیا؟ خدا معلوم تذکیر و تانیث کا کون سا شاخسانہ اٹھنے والا ہے؟ ہمیں مرشد کے سامنے اپنی جہالت کے اعتراف و اقرار میں کیا تامل ہو سکتا تھا تاہم نوجوانوں کی پوری معنوی نسل کو اپنے سامنے تختہ دار پر کھنچتے ہوئے دیکھنے سے ہم کتراتے ضرور تھے ہمیں مرشد کی ڈانٹ سے زیادہ ان کی مایوسی و آزردگی کا ڈر تھا۔ وہ گاندھی جی کی طرح دوسروں کو سزا دیتے ہوئے اپنے آپ کو سزا دینے لگتے تھے!

میں مرشد کی شاموں اور راتوں کا اردلی تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ دونوں کی بہ نسبت اپنی شبوں میں کہیں زیادہ زندہ و تابندہ نظر آتے تھے۔ دن کو تو وہ اکثر ایک نہایت واہیات سے خول میں، جس کو انہوں نے اپنی شخصیت کے اوپر منڈھ رکھا تھا، سکڑ کر بیٹھے رہتے تھے، بعض اوقات ان کا رویہ نہایت روکھا پھیکا یا سرد مہری

سے جاملتا۔ ہم نے بارہا یہ تماشا دیکھا کہ کوئی ملاقاتی پاس بیٹھا ہے مگر مرشد سگرٹ کاٹن اس کے سامنے رکھ کر خود خول میں چھپے بیٹھے ہیں۔ وہ غریب پشیمان ہو کر اٹھنے لگا تو مرشد جیسے چونک کر بولے ـــــ "ہوں ـــــ تشریف رکھیئے مولانا، آپ سے تو ابھی بہت سی باتیں کرنا ہیں" ـــــ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ تو مرشد پھر غائب

دراصل ان کے اپنے اندر اتنا کچھ تھا کہ باہر دیکھنے کی انہیں فرصت تھی نہ خواہش۔ البتہ شام کو جب آفتاب غروب ہوتا تو یہ آفتاب طلوع ہو جاتا۔ ان کی عادت تھی کہ دفتر سے آنے کے بعد کوئی کتاب سینے پر رکھ کر تھوڑی دیر کے لئے سو جاتے۔ سر شام بیدار ہوتے، غسل کرتے، لباس بدلتے، چھٹی کا دن ہوتا تو سرے سے اٹھتے ہی اس وقت، شیو بھی شام ہی کو بناتے۔ ان کے لئے جاگ کر سونا جتنا مشکل تھا، سو کر جاگنا اس سے زیادہ مشکل تھا اور جاگ کر پھر کہیں باہر جانے کے لئے تیار ہوتا تو گویا قطرے کا گوہر ہونا تھا۔ صاف ستھرا لباس پہننے کا شوق ضرور تھا مگر اس شوق کو اتنی اہمیت بھی نہیں دے رکھی تھی کہ لباس خود پہننا بھی پڑے۔ سگرٹ، کتاب اور شراب کے علاوہ وہ کسی شے کو بھی کوئی خاص اہمیت نہ دیتے تھے۔ فوجی وردی کی نوک پلک کے بارے میں سخت لاپرواہ تھے۔ مگر چونکہ بڑا جرنیلی قد کاٹھ پایا تھا اس لئے جو چیز جس طرح پہن لیتے، سج جاتی، وہ تیار ہوتے نہیں تھے، تیار کرائے جاتے تھے۔ ان کا بیٹ مین عنایت اللہ جس کو وہ علامہ کہتے تھے، بیگم حسرت پر تحسین و آفرین بھیجتے ہوئے اکثر کہا کرتا تھا ـــــ "میں تو صاحب کو بچوں کی طرح پال رہا ہوں"

مرشد تیار ہو کر بیٹھتے تو پوری 'قوم' ان کے کمرے میں جمع ہو جاتی۔ میس سے ملحق بڑی اعلیٰ نشست گاہ موجود تھی لیکن وہاں جا کر بیٹھنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا

کہ اگر مرشد کا بس ہوتا تو وہ کھانا بھی اسی میز پر کھاتے جس پر سمرسٹ اہم، جیمز جوئیس، عذرا پاؤنڈ اور بالزاک وغیرہ کے دوش بہ دوش، حجامت کا سامان، عینک اور گھڑی، سگریٹ اور ماچس، قلم اور کاغذ، معدے کے انگریزی چورن، موزے اور چھوٹی موٹی درجنوں دوسری چیزیں پڑی رہتی تھیں "محفل نورانیاں" اسی میز کے گرد جمتی۔ مرشد اس وقت اپنے آپ کو خول سے نکال کر گویا میز پر رکھ دیتے اس وقت ان کے چہرے کی شگفتگی اور گھنی گنجان مونچھوں میں سے پھوٹ کر کان کی لوؤں تک پھیلتی ہوئی ایک دل آویز مسکراہٹ دیکھنے کی چیز ہوتی تھی۔ شام ہوئی اور مرشد نے اپنا مخصوص نعرۂ مستانہ بلند کیا:

"ذرا خان صاحب کو آواز دینا"۔

یہ خان صاحب پوری یونٹ کے کوارٹر ماسٹر تھے جو عملاً مرشد ہی کے لئے وقف ہو کر رہ گئے تھے۔ وہ بیچارے صبح سے اس آواز کے منتظر ہوتے اور آواز سنتے ہی میز کو کارگہ شیشہ گراں بنا کر رکھ دیتے۔ مرشد کی "محفل شبینہ" کی پہلی مجلس ڈنر تک جاری رہتی اور ڈنر وہ گیارہ بجے سے پہلے شاذ ہی کھاتے۔

یہ محفل شبینہ، ——— "ذرا خان صاحب کو آواز دینا" ——— سے شروع ہو کر عموماً اس مقام پر ختم ہوتی جہاں یا تو حلق سے کوئی آواز نکل ہی نہ سکتی یا لوگ اپنے آپ کو آوازیں دینے لگتے۔ مرشد کو اپنے دور کے کسی شاعر کا کوئی شعر شاید ہی یاد ہو مگر اساتذہ قدیم کے بلا مبالغہ ہزاروں اشعار سینے میں محفوظ تھے۔ بالعموم وہ داغ سے شروع ہوتے پھر جوں جوں کیف بڑھتا جاتا جوں توں غالب و بیدل سے ہوتے ہوتے، عرفی و نظیری، سعدی و حافظ کی طرف اوپر ہی اوپر چڑھتے جاتے۔ دوسرں

کے شعر پڑھنے میں انہیں جتنی راحت ہوتی اپنے شعر سنانے میں اتنی ہی وحشت ہوتی۔ ہم اصرار کرتے تو لاحول پڑھ کر ٹال دیتے لیکن محفل شبینہ کے آخری رسیلے لمحات میں ہتھیار ڈال دیتے اور پھر ایک نہایت پُرسوز، کھوئے کھوئے، ڈوبتے ابھرتے ترنم کے ساتھ، جس میں ماورائے سخن بھی ایک بات ہوتی تھی، ڈھائی تین تین شعروں کی دو چار غزلیں سنا دیتے۔ ان کی مشہور غزل ——— آؤ حسن یار کی باتیں کریں ——— "ہمارا قومی ترانہ" تھی جس کے بعد مرشد حسن یار کی باتوں سے آگے نکل کر خود آستان یار کی طرف چل پڑتے۔

"ہاؤ ہو" کی یہ محفلیں مرشد کے کلاسیکی مذاق ادب، ان کے وسیع معلومات، دلنشین ظرافت، شستہ و برجستہ بذلہ سنجی، اور برمحل اعلیٰ اشعار کے ترشح کے باعث ایک سدابہار دبستان علم و دانش کا درجہ رکھتی تھیں۔ باتوں باتوں میں ہم وہ کچھ سیکھ جاتے جو برسوں کے باقاعدہ اکتساب سے بھی شاید ہی سیکھ سکتے۔ بحث کے معاملہ میں ان کا معاملہ یہ تھا کہ ——— اک ذرا چھیڑیئے پھر دیکھیئے کیا ہوتا ہے ——— چنانچہ انہیں چھیڑنے کے لئے ہم کوئی غلط نظریہ، کوئی متنازعہ فی محاورہ، کوئی بھونڈا اسلوب بیان شیر شاہ سوری کا غلط سال جلوس، شبلی کے ماخذات، سیماب اکبر آبادی کا کوئی شعر، ——— غرضیکہ کوئی سی بات مصرع طرح بنا کر چھوڑ دیتے اور مرشد مشرق و مغرب کی وسعتیں سمیٹ کر دیکھتے دیکھتے معلومات کا ایک قطب مینار کھڑا کر دیتے۔ کسی لفظ کی صحت کے درپے ہو گئے تو ارُدو، فارسی اساتذہ کے ایک مشت پندرہ بیس اشعار گویا ایک دوسرے سے بندھے ہوئے چلے آ رہے ہیں۔ قدیم اساتذہ میں سے وہ خدا معلوم کہاں کہاں سے ایسے ایسے گمنام لیکن جید شعراء کو ڈھونڈھ نکالتے جن کو جاننا ادب کو جاننے

کے لئے لازمی ہے مگر جانتا کوئی نہیں۔ اُردو شاعری میں وہ حسرت موہانی اور اقبال کے بعد کسی شاعر سے کوئی سروکار نہ رکھتے تھے۔ جن شعراء کا کلام نظر سے گزرتا تھا یا جن کو ذاتی طور پر جانتے تھے۔ مرشد نے ان کو صرف دو درجوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ سوجھ بوجھ کا شاعر اور بجواس ـــــ کسی لفظ کے حسب نسب کا مسئلہ درپیش ہے تو چراغ لے کر مصر و یونان کے اندھیروں میں اتر جاتے اور عرب و عجم، افغانستان و کشمیر سے ہوتے ہوئے جب مراجعت فرماتے تو ترکی الاصل، عربی النسل، ایرانی نژاد ـــــ اور خانہ زاد والفاظ کے الگ الگ جلوس ان کے ہم کاب ہوتے ـــــ تاریخ پر عبور کا یہ عالم کہ غیاث الدین بلبن کے رکاب داروں کے نام مع سن ولادت و وفات سن لیجئے۔ سکندر اعظم مقدر دنیا سے چل کر جن جن راستوں سے ہوتا ہوا بیاس تک پہنچا تھا مرشد ان راستوں کے ایک ایک پتھر سے واقف تھے۔ ـــــ اسلام کے تہذیبی معاشرتی اثرات پر ان کی نظر اتنی گہری تھی کہ صدیوں کی دھوپ چھاؤں کے ایک ایک سائے کو علیحدہ علیحدہ کر کے دکھا دیتے۔ دوسری طرف پراچین، ہندو دیو مالا میں بھی بڑی دور تک پہنچے ہوئے تھے۔ افسانوی دیوی دیوتاؤں کے باہمی رشتوں ناطوں، جھگڑوں اور رنجشوں سے پورے پورے باخبر، علم طب سے اتنا گہرا شغف کہ اگر وہ دب کے بجائے طب میں جا پڑتے تو شاید زیادہ آسودہ رہتے۔ مزے کی بات یہ کہ فلسفہ ہو یا فلکیات، بات اس قدر سلجھا کر بیان کرتے کہ مولانا صلاح الدین احمد کے الفاظ میں "موضوع کو پانی کر کے چھوڑتے"۔ تاریخ ان کا خاص مضمون تھا مرشد جو کچھ بولتے تاریخ معلوم ہوتا۔ جو کچھ لکھتے تاریخ بن جاتا۔

مرشد موج میں ہوتے تو نکتہ طرازی و انجمن سازی کے لئے کوئی غلط بات کہتے

کی بھی چنداں ضرورت نہ ہوتی۔ اس کیفیت میں وہ صحیح بات کے بھی پرزے اڑا دیئے بالخصوص جہاں ذاتی پسند یا رائے کی گنجائش ہوتی۔ مثلاً اگر آپ گاندھی جی کی عظمت بیان کر رہے ہیں تو مرشد بندوق کی نالی گاندھی جی کی طرف سیدھی کر دیتے۔ اگر آپ گاندھی جی کی مذمت کر رہے ہیں تو مرشد اپنے ترکش کے سارے تیر لے کر گاندھی جی کی حمایت میں سینہ سپر ہو جاتے۔ اصلیت، جہاں تک میں سمجھ چکا ہوں، یہ تھی کہ ایک عظیم جینئس ہونے کی وجہ سے ان کی اپنی انا کا جذبہ بڑا قوی تھا۔ وہ بڑی سے بڑی شخصیت سے مرعوب ہونے کو تیار نہ تھے۔ چھوٹوں کے سامنے وہ جس عاجزی سے بچھے جاتے تھے بڑوں کے سامنے اتنی ہی سرکش نظر آتے۔ لیکن پھر چند شخصیتیں ایسی بھی تھیں جن کے سامنے ان کی گردن ہر وقت جھکی ہوئی ملی، علامہ اقبال اور مولانا ابوالکلام آزاد کے خلاف وہ ایک لفظ بھی نہ سن سکتے۔

دوستوں کی محبت ان کی زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ، سب سے بڑی تسکین تھی مگر دوستی کرنے میں وہ تقدم یا تیزی کے قائل نہ تھے۔ مدت تک یہی نہ کھل سکتا کہ وہ دوست بننے پر آمادہ بھی ہیں یا نہیں لیکن اندر ہی اندر نہایت نامعلوم طور پر وہ دوسرے کے دل میں سما جاتے اور پھر دوستی میں ان کی بے بسی یہاں تک پہنچ جاتی کہ دوست اگر دشمن بھی ہو جاتا تو وہ اسے چھوڑ نہ سکتے۔ عالی ظرفی کا یہ حال تھا کہ وہ سالک صاحب کی سب سے زیادہ عزت ہی اس لئے کرتے تھے کہ سالک صاحب فن میں ان کے سب سے بڑے حریف تھے۔ احمد شاہ بخاری، مجید ملک، مولانا صلاح الدین، صوفی تبسم، تاثیر، عابد، فیض، تاج کا ذکر ہمیشہ بڑی محبت اور شگفتگی کے ساتھ کرتے اور ہندوستان بھر میں بہت کم لوگوں کو ان کے پلّے کا آدمی سمجھتے۔ نیاز مندوں کی

ادبی خامیوں پر اندر خانے خواہ ان غریبوں کو کھا جاتے مگر بیرونی معرکوں میں مرشد کا طاقتور قلم ان کی ڈھال بن جاتا۔ اپنے ساتھ بیدلؔ۔ نظیریؔ۔ ظہوریؔ، فغانیؔ وغیرہ کو بھی دوست کی کمک پر لے آتے۔ دوستوں سے وہ کمزوری کی حد تک محبت کرتے تھے۔ افراد و افکار کے بارے میں ان کے جمے ہوئے نظریات و تعصبات اتنے بھاری پتھر تھے کہ کوئی دوسرا تو کیا، ان چٹانوں کو وہ خود بھی اپنی جگہ سے ہلا نہ سکتے تھے سنگاپور میں وہ اپنے لاہور کے بعض ایسے جگری دوستوں کا تذکرہ اکثر بڑے فخر کے ساتھ کیا کرتے تھے جن میں سے ایک دودھ دہی کی دکان کرتا تھا۔ ایک لوہے کے نلکے ٹلکیاں بیچتا تھا اور ایک حسرت صاحب سے دوستی کے علاوہ سرے سے کوئی کام ہی نہ کرتا تھا وہ جب ان کی بے غرض محبت، بے ریا خلوص، بے لوث وابستگی میں اپنے حسن بیان کا جادو جگاتے تو یوں معلوم ہوتا کہ یہ لوگ جیسے ناولوں کے ہیرو تھے جو کتابوں سے نکل کر لاہور کے گلی کوچوں میں چلے آئے تھے۔ بعض اوقات مرشد عشرت و آسودگی کے اس ماحول میں، جو وہاں انہیں میسر تھا ان دوستوں کی یاد میں تڑپ اٹھتے، مغموم ہو جاتے اور ملازمت ترک کر دینے کے منصوبے سوچنے لگتے ان کے ایک عزیز دوست ریاض شمیم (اب لیفٹیننٹ کرنل) جب اتفاقاً تبدیل ہو کر سنگاپور آ گئے تو مرشد اس قدر خوش ہوئے کہ اس طرح بے تحاشا خوش ہوتے ہم نے انہیں کبھی نہ دیکھا تھا۔ ہفتوں بھر ملنے والے سے ریاض شمیم کا تذکرہ چلتا رہا۔

"مولانا، سنا آپ نے۔ ریاض شمیم بھی یہیں آ گئے۔"

"میں دہلی میں تھا تو وہ دانا سے بدل کر دہلی آ گیا، پھر کلکتے، اور اب میرے پیچھے پیچھے یہاں بھی۔"

"آپ ریاض شمیم سے ملے ہیں؟ ـــــ ضرور ملیئے گا ـــــ حسین بھی ہے ذہین بھی ہے۔"

ان کا سینہ یقیناً آرزوؤں اور ارادوں کا تلاطم زار ہو گا مگر وہ اپنی آرزوؤں محرومیوں کی کتھا سے دوسروں کو کبھی مکدر نہ کرتے تھے۔ وہ زندگی کے ہر روپ کو ایک انعام، ایک فیضان سمجھتے تھے۔ بہرحال جن دو ایک آرزوؤں کی بہ آواز بلند پرورش کیا کرتے رہتے تھے۔ ان میں سے ایک سلسلہ وار آرزو یہ تھی کہ دریا کے کنارے ایک معقول سا گھر ہو، ڈھنگ کی لائبریری ہو، جس میں بیٹھ کر وہ سمرنا سے بغداد سے سمرنا تک کی تاریخ لکھتے رہیں، اور چند یار جانی ہوں جن کے ساتھ شام کو ہاؤ وہو رہے غالباً یہ تنہا آرزو ہے جس تکمیل کے لئے انہوں نے عملی اقدام بھی کیا تھا۔ پلونچھ میں دریا کے کنارے ایک مکان بنوا لیا تھا کتابوں کا خاصہ ذخیرہ جمع کر لیا تھا۔ مگر افسوس کہ حالات اور زندگی نے انہیں وہ کام نہ کرنے دیا جو صرف وہی کر سکتے تھے۔

لاہور شہر اور اس کی زندگی سے مرشد کو عشق تھا ـــــ سنگاپور کہ جنوب مشرقی ایشیا کا پیرس سمجھا جاتا رہے، بڑا ہی جمیل و تاب ناک شہر ہے۔ جنگ کے بعد فتح کی مسرتوں نے ان دنوں اس کو کچھ اور زیادہ پیرس بنا رکھا تھا۔ شراب وافر تھی، وقت اپنا تھا۔ غالب نے جو بات آم کے بارے میں کہی ہے وہی بات اس خطے کے زہرہ شمائلوں پر صادق آتی تھی کہ عام بھی تھے اور شیریں بھی۔ آباد میخانے، شاداب رقص گاہیں۔ خوابگوں ساحل، گاتے ہوئے کیبرے، جگمگاتے ہوئے کلب، معمور ریستوران ہیپی ورلڈ گریٹ ورلڈ کے طرب خانے، آزادی، فرصت، فراغت مرشد کو

اور کیا چاہیئے تھا؟ انہیں اس شہر سے یک گونہ لگاؤ بھی پیدا ہو گیا تھا۔ سنگاپور نے انہیں زندگی کے دو ایسے بہترین اور عہد آفرین سال دیئے تھے کہ ہر برس کے تھے دن پچاس ہزار مگر اس کے باوجود سواد رومتہ الکبریٰ میں انہیں اپنی دلی یعنی لاہور کی یاد ہمیشہ تڑپاتی رہی۔ میں ہر وقت سائے کی طرح ان کے ساتھ لگا رہا ہوں مجھے ایسا کوئی لمحہ یاد نہیں جب وہ لاہور کی یاد سے غافل ہوئے ہوں۔

"مولانا یہ شہر بکواس ہے۔"

"مولانا اس شہر کی اپنی کوئی شخصیت نہیں۔"

"مولانا سنگاپور کو آپ اٹھا کر فرانس میں بھی رکھ سکتے ہیں۔"

اور لاہور کے فضائل ہیں:

"مولانا لاہور بجلی کا بٹن دبانے سے نہیں بن گیا۔"

"مولانا لاہور ایک تہذیب، ایک وضع کا نام ہے۔"

"مولانا، لاہور، لاہور ہے۔"

مجھے اچھی طرح یاد ہے، ایک دعوت میں مرشد ایک میجر سیٹھی سے اتنی سی بات پر سچ مچ لڑ پڑے تھے کہ سیٹھی کے والد لاہور کی سکونت ترک کر کے لکھنؤ جا بسے تھے۔

مرشد کی رند مشربی کوئی ڈھکی چھپی چیز نہیں۔ نہ اتنی معمولی چیز ہے کہ میرے چھپائے چھپ سکے۔ وہ خرابی کے پورے معنوں میں رند خرابات تھے۔ انہیں سگریٹ، کتاب شراب سے الگ کر کے دیکھا ہی نہیں جا سکتا۔ انہیں اس طرح دیکھنا غلط بھی ہو گا پینے کے معاملے میں وہ شاعری کے روایتی بلانوش کی طرح دریا سمیٹ کر پی جاتے تھے۔ جتنی پیتے جاتے حواس اتنے ہی روشن ہوتے جاتے۔ بڑی مشکل یہ تھی کہ ان

کے بھکنے کا آسانی سے پتہ بھی تو نہیں چل سکتا تھا۔ آنکھیں عموماً ویسے ہی سرخ و مست رہتی تھیں۔ ہائے وہ یوں کب جانتے تھے کہ کھوئے جانے کا سراغ مل سکے اگر کوئی ٹوکتا کہ مولانا آپ شاید بھک گئے ہیں تو جواب ملتا —— مولانا آپ بھک گئے ہیں۔ میرا تو سر دامن بھی ابھی تر نہیں ہوا۔ پھر ہوش مندی کا ثبوت دیتے ہوئے تین چار ساغر پے در پے خالی کر جاتے۔ ان کا بھکنا اگر کچھ تھا بھی تو ایک نہایت معصوم سا، بڑا علمی قسم کا بھکنا تھا۔ طنز نوکیلا ہو جاتا، لطیفے بھرپور ہو جاتے، اشعار کی روانی طغیانی پر آجاتی۔ معصیت و بخشش کے مضامین زور باندھ دیتے جن اشعار کو وہ پہلے پینے کا عنوان بناتے تھے انہیں اشعار کو بعد میں رونے کا سامان بنا لیتے۔ ہم نے اپنی سہولت کے لئے یہ علامت مقرر کر چھوڑی تھی کہ مرشد جس وقت لاہور یا سالک صاحب کے موضوع پر بلاوجہ ہی دوسروں سے الجھنے لگیں تو یہ سمجھئے کہ وہ بھک گئے۔ اس مرحلہ پر وہ خان صاحب کو ہزار آواز بھی دیتے خان صاحب قریب نہ پھٹکتے۔

مرشد ہر شام کو جس فراوانی سے پیتے، جس باقاعدگی سے رات کو "شگفتن گلہائے ناز" کی سیر کو نکلتے اور پھر جس یک سوئی کے ساتھ ان نظاروں میں الجھ کر رہ جاتے تھے۔ اس کے بعد ان سے یہ توقع رکھنا کہ انہیں اپنے گھر بار، بیوی بچے کا بھی کچھ خیال ہوگا، ایک زیادتی کی بات تھی۔ بظاہر ان کی وارفتگی سے یہی معلوم ہوتا تھا کہ:

دل میں ذوق وصل و یاد یار تک باقی نہیں

لیکن سب قیاس ہی قیاس تھا۔ مرشد کی شخصیت کا سب سے حیرت

حیرت انگیز پہلو یہ ہے کہ وہ اندر ہی اندر ایک نہایت جے ہوئے گھریلو قسم کے انسان تھے۔ بڑے شفیق باپ۔ نہایت رقیق القلب شوہر، اپنی ساری ماورائیت کے باوصف ان کا دل ہر وقت لاہور یا پونچھ میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ دھڑکتا رہتا تھا—— گھر سے خط آنے میں دو روز کی تاخیر ہو جاتی تو پریشان ہو جاتے۔ جوابی تاروں کا سلسلہ باندھ دیتے۔

بازار کی خرید و فروخت سے انہیں سخت وحشت ہوتی تھی ان کی ضرورت کی اکثر چیزیں ہمیں لوگ خریدا کرتے۔ مگر جب کبھی خود بازار میں نکلتے تو ظہیر و زینب کے لئے ضرور کوئی نہ کوئی تحفہ خرید لیتے۔ ظہیر کو اتنے لمبے لمبے اور پیارے پیارے خط لکھتے کہ اگر اتنا وقت مستقل تصنیف کی طرف دیا ہوتا تو وہ "بغداد سے سمرنا" تک والی تاریخ لکھ ڈالتے—— ایک مرتبہ آپ وہاں ذرا ایک—— باقاعدہ عشق میں مبتلا ہو کر عقد ثانی پر آمادہ ہو گئے تھے۔ مہینوں تگ و دو ہوتی رہی۔ سینکڑوں ڈالر کے تحائف لڑکی والوں کی نذر کر دیئے مگر جب عقد کی ساعت قریب آئی تو ظہیر یاد آگیا—— زینب یاد آگئی—— پونچھ یاد آگیا—— اور آخرش اپنے ہونے والے معزز خسر کو یہ پیغام بجھوا دیا کہ مولانا مجھے معاف کر دو—— مجھ پر لعنت بھیجو —— مجھے بھول جاؤ!

مرشد کی گشت شبینہ کا انداز بھی کچھ اپنا ہی تھا۔ مغربی موسیقی سے انہیں ہول آتا تھا۔ فلم دیکھنے کو وہ تضیع اوقات سمجھتے۔ البتہ چینی ملائی، انڈونیشی اوپیروں کو شوق سے دیکھتے لیکن کسی ایک مقام پر دیر تک بیٹھے رہنا ان کے لئے قریب قریب ناممکن تھا۔ ہوتا یہ تھا کہ کسی ابتدائی گیت پر یا منظر پر خوش بھی ہو لیتے،

سر بھی ہلا دیا۔ ساتھ ساتھ کلچر کی بحث بھی اٹھاتے رہے مگر پھر دس پندرہ منٹ کے بعد اکتا بھی گئے۔

"مولانا یہ تو بکواس ہے ——— آئیے کہیں اور چلتے ہیں"۔

اس کے بعد کہیں اور ——— پھر کہیں اور ——— اور جب تک شہر کا آخری اوپیرا بند نہ ہو جاتا "کہیں اور" کا سلسلہ بند نہ ہوتا۔ ریستورانوں میں بیٹھنے کا بھی یہی ہنجار تھا۔ ایک سے دوسرے میں دوسرے سے تیسرے میں۔ کہیں دو منٹ کو بیٹھ جاتے، کہیں بس جھانک کر لوٹ آتے، کہیں لوگ بہت زیادہ ہوتے کہیں بہت کم ہوتے۔ ہر رات قریباً سارا شہر گھوم کر لوٹتے، وہ تھوڑی سی مہلت میں بہت کچھ دیکھ لینا چاہتے تھے۔ کیسی بھی جگہ ہو، ایک مقام سے بہت جلد ان کی طبیعت بھر جاتی تھی، مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زندگی سے بھی شاید اسی لئے وہ بہت جلد اکتا گئے۔

سیر و سفر میں کبھی کبھار وہ بے مقصد و بے اختیار سے ہو کر ——— جیسے ندی میں کوئی سنگ رواں آوارہ ——— گھومنے کے بھی بڑے حامی و مبلغ تھے۔

"مولانا ان نپی تلی شاہراہوں میں دھرا ہی کیا ہے"۔

"مولانا زندگی بڑی بیکراں چیز ہے"۔

"مولانا زندگی کو آگے پیچھے شمال جنوب ہر طرف سے دیکھنا چاہیے"۔

"مولانا آئیے آج ہم اپنے آپ کو شہر پر چھوڑ دیں"۔

اور اپنے آپ کو شہر پر چھوڑنے کے معنی یہ ہوتے کہ وہ حسرت صاحب جو صبح کی سیر میں پیدل نہ چلتے تھے، گھنٹوں شہر کے دالان در دالان قسم کے عقبی کوچوں

میں مارے مارے پھرتے۔ ایک مرتبہ اپنے آپ کو جزیرے پر "چھوڑتے چھوڑتے" ہم ایک ایسے ساحلی کمپونگ یعنی گاؤں میں جا نکلے جہاں تک پہنچنے سے پہلے ایک وسیع وطویل دلدل کے اوپر تنگ تختوں کے ایک جھولتے لرزتے "پل صراط" پر سے گزرنا پڑتا تھا۔ جن لوگوں نے مرشد کو دیکھا ہے وہ ان کی مصیبت کا اندازہ کر سکتے ہیں مگر زندگی کو آگے پیچھے سے دیکھنے کے ولولے میں وہ اس "پل صراط" پر سے بھی گزر گئے!

یہاں ایک واقعہ یاد آگیا۔ انہیں دنوں مرشد کے دوست مشہور ادیب پروفیسر احمد علی ہندوستان سے چین جا رہے تھے ان کا جہاز شب کے چند گھنٹوں کے لئے سنگاپور میں رک رہا تھا۔ مرشد ایک مدت سے ان کی راہ تک رہے تھے اور ان کے چند گھنٹوں کے قیام کو پر لطف بنانے کے لئے کوئی پورے تین شب و روز کی مصروفیت طے کر چھوڑی تھی۔ لیکن اتفاق دیکھیے کہ جس شام احمد علی وہاں پہنچے ہیں، مرشد کو سو کر جاگنے، جاگ کر اٹھنے، اٹھ کر تیار ہونے اور پھر دو تین ساغر برائے ملاقات پینے میں اتنی دیر ہو گئی کہ جب ہم لوگ جہاز پر پہنچے تو پروفیسر صاحب شہر کی گشت پر پر نکل چکے تھے۔ اب انہیں ڈھونڈھنے کا مرحلہ شروع ہوا۔ جاوید نے کہا کہ اتنے بڑے اجنبی، پر اسرار شہر میں اندھا دھند تلاش سے کون مل سکتا ہے۔ لیکن مرشد بہت پُر امید تھے۔ فرمایا ——— "کیوں نہیں ملے گا۔ مجھے معلوم ہے احمد علی کو جانتا ہوں ——— تلاش شروع ہوئی تو احمد علی کو جہاں جہاں ہونا چاہیئے تھا، ایک ایک مقام چھان مارا مگر وہ خدا معلوم کہاں غائب ہو گئے تھے۔ کوئی بارہ بجے کے قریب مرشد یہ کہہ کر ذرا تازہ دم ہو کر ابھی پھر نکلتے ہیں۔ ایک چینی ریسٹورنٹ میں گھس

گئے اور وہاں جام و مینا سے نہ معلوم کیا سرگوشیاں ہوئیں کہ خیالات کا دھارا احمد علی کو پا سکنے کی رجائیت کی طرف سے یک بارگی احمد علی کو نہ پا سکنے کی قنوطیت کی طرف مڑ گیا۔ بولے:

"مولانا یہ احمد علی تو ملتا دکھائی نہیں دیتا۔"

"کیوں؟" ——— ہم نے پوچھا۔

"مولانا چینیوں کے اس شہر میں احمد علی کا ملنا ناممکن ہے۔ بات یہ ہے کہ سامنے کے رخ سے احمد علی بھی ساٹھ فی صدی چینی معلوم ہوتا ہے اور چینیوں کے انبوہ میں کسی چینی سے آپ خط و کتابت تو کر سکتے ہیں اسے شناخت نہیں کر سکتے ——— اب اسے جہاز پر ہی پکڑیں گے۔"

پھر وہیں بیٹھے بیٹھے مرشد نے جو احمد علی کی باتیں شروع کی ہیں کہ وہ کتنا پیارا آدمی ہے، کتنا نڈر ادیب ہے، کتنا قیمتی دوست ہے تو درمیان میں ہمارا وقفہ بہ وقفہ یاد دہانیوں کے بعد جب ریستوران سے اٹھ کر آخر جہاز پر پہنچے تو جہاز ہانگ کانگ کو روانہ ہو چکا تھا بعد میں خط و کتابت سے معلوم ہوا کہ پروفیسر صاحب نے بھی اس شب اپنے آپ کو سنگاپور پر چھوڑ رکھا تھا۔

مرشد گو کھانے سے زیادہ پینے کے قائل تھے۔ تاہم ادب کی طرح کھانے کا بھی بڑا ہی کلاسیکی مذاق رکھتے تھے۔ ذائقہ تو بعد کی بات تھی، کھانے کی صورت بری ہوتی تو اس پر بھڑک اٹھتے۔ طبیعت منغض ہو جاتی اشتہا مر جاتی۔ کھانا کھانے کے بجائے کھانا نہ کھانے کے حق میں تقریر کرتے۔ نوابان اودھ، سلاطین کشمیر اور قطب شاہی علی تلی خانوں کے مطبخوں، دستر خوانوں کے متعلق وہ جو وسیع ذاتی معلومات رکھتے

تھے۔ ان معلومات نے مرشد کو اس ضمن میں کچھ اور بھی مشکل پسند بنادیا تھا ذائقے اور تنوع کے لحاظ سے کشمیری کھانے کو کھانوں کا بادشاہ مانتے تھے۔ شب دیگ، گوشتابہ، مکیخوانہ، آفتابہ وغیرہ کشمیری کھانوں کی ایک طویل فہرست تھی جو ہمیں ہر کھانے پر سننا پڑتی۔ بارہا مرشد نے شب دیگ خود اپنے ہاتھ سے دم کرنے کا پروگرام بنایا لیکن دیگ میسّر آسکی نہ شب ایک مرتبہ ایک چینی لکھ پتی کی دعوت پر جب کوئی پچاس کورسوں کے ڈنر سے سابقہ پڑا۔ جس میں چینی باورچیوں نے چڑیا کی ایک چونچ میں ترش، نمکین، شیریں مچھلی تل کر سامنے رکھ دی تھی تو مرشد چینیوں کی عظمت کے بھی قائل ہو گئے تھے مگر قیادت کا جھنڈا پھر بھی کشمیر ہی میں لہراتا رہا۔

دو سال کے بعد مرشد ۸ رفروری ۱۹۴۰ء کو ہم سے رخصت ہوئے احباب کا ایک ہجوم الوداع کہنے کو ساحل پر موجود تھا۔ جس میں فوجی افسر، سردار، سپاہی سبھی شامل تھے۔ مقامی ملاقاتیوں کا بھی ایک جم غفیر پہنچا ہوا تھا۔ ملائی معززین، عرب سوداگر، چینی آرٹسٹ اور ہیپی ورلڈ اور گریٹ ورلڈ کے خدمت گار ایک اجنبی کو رخصت کر رہے تھے۔ ان میں بہت تھوڑے تھے جو ادیب چراغ حسن حسرت کی عظمت سے واقف تھے۔ ان لوگوں کو انسان چراغ حسن حسرت کی محبت جزیرے کے کونے کونے سے کھینچ لائی تھی۔ ہم سے ہمارا مرشد جدا ہو رہا تھا۔ سپاہی ایک ایسے افسر کو رخصت کر رہے تھے جو افسروں کی نوع ہی سے مختلف تھا۔ مقامی احباب اس شخص کو الوداع کہہ رہے تھے جس سے مل کر وہ ایشیا کے ایک عظیم ملک کی روح میں جھانک سکے تھے، ہیپی ورلڈ کے خدمت گار اس محسن سے محروم ہو رہے تھے جو چائے پئے بغیر بھی بڑی باقاعدگی، بڑی فیاضی سے ان کو ٹپ دیتا تھا اور جب عظیم

"ڈوبرژن شایہ"، لنگر اٹھا کر آبنائے ملا کا کے کھلے دہانے کی طرف رینگنے لگا تو ہمیں یوں محسوس ہوا جیسے زندگی کے وہ دو سال ہماری پوری زندگی پر پھیل گئے ہوں۔ جذبات کے ایک مشترکہ جھٹکے سے ہر دل بوجھل، ہر آنکھ نمناک ہو گئی مگر جو شخص بچوں کی طرح بلبلا کر رو پڑا وہ مرشد کا اردلی علامہ عنایت اللہ تھا جو مرشد کو بچوں کی طرح پالتا رہا تھا۔

وہ ادائے دلبری ہو کہ نوائے عاشقانہ
جو دلوں کو فتح کر لے وہی فاتح زمانہ

اسلامی معلومات

شاہد حمید

بک کارنر جہلم

سیدنا

خالد سیف اللہ

تالیف

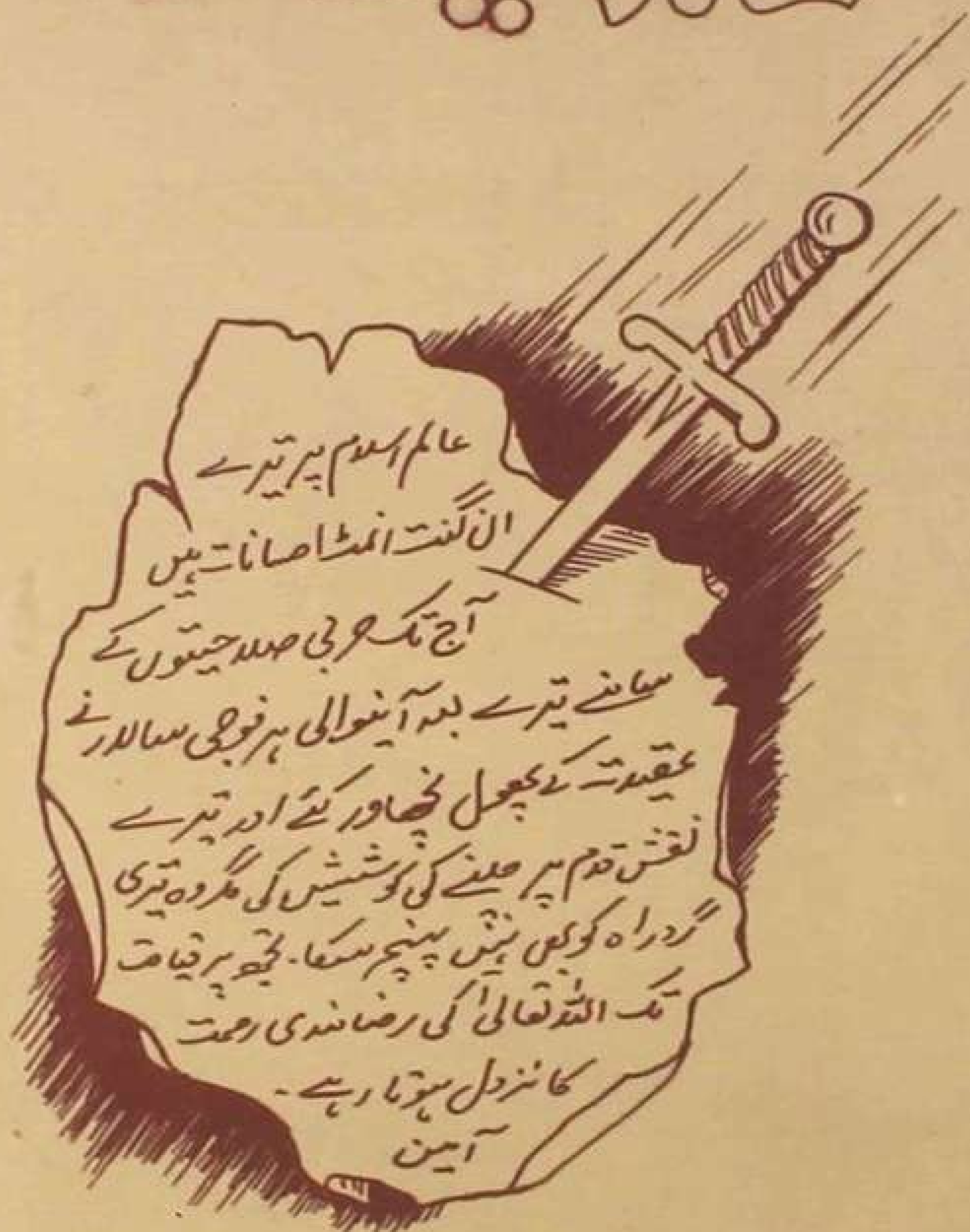
حکیم فیض عالم صدیقی

کتب فروشوں، سکولوں کالجوں کو خصوصی رعایت

بک کارنر

چوک فیصل شہید جہلم

خالد سیف اللہ



حکیم فیض عالم صدیقی

○ ضمیر جعفری کی تحریریں کشمیر کے زعفران مُسکراتے ہیں۔ مولانا چراغ حسن حسرتؔ مرحوم

○ مزاح کی صنف میں اتنی مضبوط مگر ابریشمی نثر کم نظر آئے گی۔ سید عابد علی عابدؔ (مرحوم)

○ سید ضمیر جعفری اپنی مزاحیہ و طنزیہ شاعری کے حوالے سے اتنے مشہور اور محبوب ہو چکے ہیں کہ اُن کی شگفتہ نثر اُن کی ظریفانہ شاعری کے غلغلے میں دب کر رہ گئی ہے۔ حالاں کہ بشاشت میں رچی ہُوئی ایسی نثر ہمارے ہاں کم لکھی گئی ہے۔ ضمیر جعفری مٹھاس کا دریا اور تازگی کا ساون ہیں۔ ان کی تحریریں پڑھتے وقت افسردگی کی دُھند چھٹ جاتی ہے۔ نثر ہو یا نظم —— سید ضمیر جعفری نے "عرُوض" سے زیادہ زندگی کے طُول و عرض کو سیراب کیا ہے۔ شفیق الرحمٰن

○ سید ضمیر جعفری نے مجھ جیسے کتنوں کو ہنسایا ہوگا اور پھر ایک ایسے دَور میں کہ رونا سستا اور ہنسی مہنگی ہو گئی ہے۔ ڈاکٹر نبی بخش بلوچ

○ ضمیر جعفری کا شمار برِصغیر کے معدودے چند مزاح نگار شاعروں اور ادیبوں میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنی تخلیقات میں نئی نئی راہیں اختراع کی ہیں۔ وُہ اس لئے بھی دُوسروں کے مقابلے میں مُنفرد و ممیّز ہیں کہ مزاحیہ شاعری اور فکاہیہ نثر کے ساتھ ساتھ سنجیدہ غزل گوئی میں بھی ان کا مقام ہے اور ان کی یہی "دوعملی" ہمیں عزیز ہے۔ زیرِ نظر مجموعہ اُن فکاہیہ تحریروں پر مشتمل ہے جو اُنہوں نے گذشتہ برسوں میں تخلیق کیں اور ان پر قارئین سے بے تحاشا داد بھی وصُول کی اور وُہ اس قندِ مکرّر سے قارئین کو دوبارہ تالیاں بجانے پر مجبُور کرنا چاہتے ہیں۔ جمہُوریّت کے احیاء کے زمانے میں تالیاں بجوانے کا شوق کِسے نہ ہوگا۔ پھر پیر و مُرشد اس میں کیوں دُوسروں سے پیچھے رہ جائیں جب کہ ان کے ووٹروں کی تعداد بہت زیادہ ہے (خصُوصاً خواتین کے حلقوں میں)۔

ضمیر جعفری زندگی اور معاشرے سے گہری کومٹمنٹ رکھتے ہیں۔ ان کے مضامین ان کے ضمیر کی آواز ہیں۔ وُہ چھوٹے سے چھوٹے موضوع پر بڑی سے بڑی تحریر پیش کرنے پر قادر ہیں۔ ان کی ہنرکاری لفظی بازی گری نہیں بلکہ فکر کی گہرائی اور زندگی کی رنگارنگی سے حرارت حاصل کرتی ہے۔ ان فکاہیہ نثری شہ پاروں میں ان کی ہُنرمندی اور جولانیِ فکر کا حسین امتزاج ان کے طویل سفر کی علامت ہے۔ یہ مجمُوعہ یقیناً لطیف ادب میں سنگِ میل کی حیثیت ثابت ہوگا۔

وحید قریشی